قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
جمہوریت نہیں خلافت	ڈاکٹر سید عبدالودود	۲۳
ضابطۂ حیات	محمد عمر دراز	۴۶
من اپنا پرانا پاپی تھا	خدا بخش بلوچ	۶۳
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ڈاکٹر صلاح الدین اکبر	۶۷
تبادلِ معاشی نظامِ قرآن	محمد ارشاد	۶۹
حقائق و عبر	ادارہ	۷۱
نقد و نظر	ادارہ	۷۲
قرآن، بچوں کے لئے	قاسم نوری	۷۴
درسِ قرآن	ادارہ	۷۶
انگریزی مضامین		۷۹

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ ——— جنوری ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۱

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

آپ کسی سے بات کیجئے اور زندگی سے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصلِ گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں میں کیریکٹر نہیں ہے۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں، پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں، اہلِ محلہ میں کیریکٹر نہیں، کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں، دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوانِ حکومت میں، اربابِ نظم و نسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں، کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے، تو یہی مرض اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے، تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصرِ حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے اور ہر قلبِ حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی دھچکا لگا، تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اسی شرح و بسط اور تکرار و اصرار سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں، تو شاید سو میں سے ایک آدھ مشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو رشوت لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی مسل اس کے سامنے ہو، اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے سابقہ الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو، تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (DEFINITION) تو بے معنی ہے؟ لہٰذا، سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

اس موضوع پر علامہ غلام احمد پرویزؒ کا انتہائی بلیغ اور بصیرت افروز مقالہ بعنوان "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں" اس وقت ہمارے سامنے ہے، جسے ہم وقت اور حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر من و عن شائع کر رہے ہیں۔ اربابِ فکر و نظر اس موضوع پر مزید لکھنا چاہیں، تو ہمیں خوشی ہوگی۔

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (ETHICS) سے ہے، لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (DEFINITION) بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لئے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (SOREN KIERKEGARRD) کے نزدیک:۔

"اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی بُرے کا، تو وہ انسان نہیں، حیوان ہے۔"

(THE PRESENT AGE)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کیریکٹر، صداقت (TRUTH) کے مظاہرہ کا نام ہے اور جب ظاہر (APPEARANCE) حقیقت (REALITY) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے، تو اسے صداقت کہتے ہیں۔ (ADVENTURE OF IDEAS)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (GOOD) اختیار کرنے کا نام ہے۔

"خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزلِ مقصود کی طرف اُٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات بگولے کا رقص۔ (BETWEEN MAN AND MAN)

باردیو کے نزدیک "اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔" اس کی تائید (ALEXANDAR LOVEDAY) بھی کرتا ہے۔ (TEINTER) کا قول ہے کہ:۔

"انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔

(THE CONCEPT AND EDUCATION OF CHARACTER)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (DEFINITIONS) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ــــــ مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو ــــــ اس محاورہ کا پہلا

حصّہ بالکل واضح ہے۔ یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہو، تو اُس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کی پروا نہیں کرنی چاہیئے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے ــــــ یعنی جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے ــــــ تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بنیئے کا قصّہ سُنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بُلا لایا ــــــ اس لئے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفا ہو جائے گی، بلکہ اس لئے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا ــــــ سول سرجن نے مریض کو دیکھا۔ مرض کی تشخیص کی۔ پھر نسخہ لکھا کہ جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں، ڈاکٹر رخصت ہوا، تو بیٹا نسخہ لے کر بازار چلا۔ باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تاکہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے نہ خرید لینا۔ پہلے پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کریا کرم (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں جو سستا ہو، اُسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنیئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آجائے گی۔ لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بے وقوف تھا۔ جان کی حفاظت ــــــ (PRESERVATION OF SELF) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر (BY INSTINCT) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھئے، ننھی سی جان ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے راستہ میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو، تو وہ اپنی حفاظت کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے؟ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر انسان بھی اپنی حفاظت کے لئے مال قربان کر دیتا ہے، تو اس میں بلندیٔ اخلاق کی کوئی بات نہیں۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی کے ایک جبلّی جذبہ کا مظاہرہ ہے جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے ــــــ جو شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے، اُسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقۂ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصّے کو لیجئے یعنی "جان صدقۂ آبرو" اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (TIE) پڑ جائے۔ جب ان دونوں میں صرف ایک کو بچایا جا سکے، تو پھر انسان کو چاہیئے کہ جان دے دے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کے لئے جان دے دیتا ہے، ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچا لے، اسے انتہائی

نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچا لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصور سے آشنا تک نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ اس کا تعلق شرفِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے جو شخص جان دے کر شرفِ انسانیت کو بچا لیتا ہے۔ اس کے

کیریکٹر کی تعریف

متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (HUMAN VALUE) ہے۔ اس قسم کی اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لئے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لئے جان دینے والا 'صاحبِ کردار' کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی، تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت و عصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لئے جان تک دیدی، تو اس سے عفت و عصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی بدباطن، کسی شریف زادی کے برقعے کی طرف بھی بُری نگاہ سے دیکھے، تو اس لڑکی کا باپ

آبرو کا معیار

یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا۔ خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے ——— لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے، اس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی، بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہر دلعزیز (POPULAR) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (BOY FRIEND) تلاش کر لیا ہے۔

اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (HUMAN VALUE) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ "انسانی اقدار" ہر معاشرہ (SOCIETY) کی اپنی اپنی ہیں۔ ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں

مختلف اقدار ہیں

ہیں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں لیکن ایسے قبائل بھی گذرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (PURITANS) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو' اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پُرفریب طریق پر قتل کر ڈالے[1]۔

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلّمہ اندازِ سیاست و اجتماعیت ہے۔ اس مسلک کی رُو سے جو شخص دوسری قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے' اسے سب سے بڑا محبِّ وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ (RUMELIN) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

> "مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔"

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ:-

۱۔ کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا ـــــ لیکن

۲۔ یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں، حتّٰی کہ نیشنلزم کے مسلک کی رُو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا، اس تصور کی رُو سے دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے ان اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے

---

[1] "انسان نے کیا سوچا؟" صـ۱۳۴

اس لئے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضیٔ مابین سے لواطت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ یہ ایک نقطۂ نگاہ ہے۔ یعنی جب کسی بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے، تو اس کا ارتکاب قابلِ نفرت اور مستوجبِ سزا ہوتا ہے جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے نہ موجبِ عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرزِ معاشرت اور اندازِ بود و باش مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردّ و بدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالمِ اخلاقیات راشڈل (HASTINGS RASHDAL) کے الفاظ ہیں:-

"اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔"

(THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL II. P286)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، یہ اقدار عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے:-

"اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔" (ایضاً ص ۳۱۱)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL OF LIFE) سے ہے حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطحِ زندگی کو طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کہہ لیجئے۔ قرآن اسے "حیٰوۃ الدنیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے جس سے مراد ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی "قریب تر" کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ (اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رُو سے ان لذات کا حصول بُری چیز نہیں۔ وہ انہیں وجہِ جاذبیت قرار دیتا ہے لیکن اصل سوال وہاں

پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطحِ زندگی کے کسی تقاضے اور "انسانی قدر" میں (TIE) پڑتی ہے. اس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے، تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا لیکن اگر وہ انسانی قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے، تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا. مثلاً قرآنِ کریم میں ہے...

اِسے کیریکٹر کہیں گے

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ. اے ایمان والو! تم عدل وانصاف کی پوری پوری حفاظت کرو. شُهَدَآءَ لِلّٰهِ. اگر تمہیں کسی معاملہ میں گواہی دینی پڑے، تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لئے شہادت دو. وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف. اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا. فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا. اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے وہ امیر ہے یا غریب. قانونِ خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ ہے. لہٰذا خدا کا حق سب پر فائق ہے. فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا. دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے یا دولت مندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے. اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پرواہ مت کرو. وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵). ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ. یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے.

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (TIE) پڑتی ہے. عدل کی پاسبانی اور اس کے لئے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہیں. اس کے برعکس، مفادِ خویش، اعزا و اقربا کے تعلقات کا خیال، فریقِ مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ اگر سچی گواہی دی، تو یہ نقصان ہوگا، وہ ضرر پہنچے گا. لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے. اس کشمکش میں جو شخص ان طبیعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا ہے، یا شہادت دینے سے پہلوتہی کرتا ہے. اس کا کیریکٹر پست ہے. (قرآن اُسے اتباعِ ہوٰی سے تعبیر کرتا ہے. ہوٰی کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے). لیکن جو شخص ان تمام امیال وعواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا مالک ہے. حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہے. دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اُٹھتا ہے.

انسان ایسا کیوں کرے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبعی تقاضوں میں بڑی کشش و جاذبیت ہوتی ہے. دولت، ثروت، عیش و آرام کی زندگی، عزت اور نام کی شہرت، بلند مناصب و مدارج، قوت و اقتدار، حکومت. ان سب میں بڑی جاذبیت ہے. ان کے مقابلہ میں، انسانی اقدار کے تحفظ میں کون سی لذت یا منفعت ہے.

جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد و منافع اور لذات و حظائظ کو قربان کر دے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے، انسان اس قدر منافع و لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جا سکتا۔[1] وہ مفادِ خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لئے پروا نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے، تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لئے کرتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ

اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی، گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے مُنہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد، وہ اس لُقمہ کو مُنہ میں ڈال لے گا یا قاب اُٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا۔ وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کر لے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجئے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا، تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچئے کہ وہ شخص اس لقمہ کو مُنہ میں ڈال لے گا یا قاب اُٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھا لے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کر لے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اسے پلاؤ کھا لینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہو جائے گی، تو وہ اسے اسی طرح اُٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہو جائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ

---

[1] مفادِ خویش کا تحفظ درحقیقت جذبۂ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کی شاخ ہے۔

اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے، تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے گا۔ آیئے کہ دیکھیں کہ اس مقصد کے لئے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے اور قرآن اس گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں سردست انہیں چھوڑیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر "مذہب پرست[1]" یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہو جاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اُس زمانے میں تو مطمئن ہو سکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لئے وجہِ طمانیت نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک بچے کو تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں، بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لئے آمادہ ہو جائے، تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ اگر کوئی شخص گرفتاری کے ڈر سے چوری نہیں کرتا، تو اسے صاحبِ کردار نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا، مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لئے اطمینان بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

مفکّرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکّرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکّرینِ مغرب کے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکّر کا نظریہ پیش کر دیں، تو مقصد پیشِ نظر کے لئے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکّرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ اربابِ فکر سے پوشیدہ نہیں ـــــ کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (GOOD WILL) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

"اس دنیا میں، بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں، جسے بلا مشروط خیرِ محض کہا جا سکے،

---

[1] اسلام، دین ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا، لیکن اب اسے مذہب ہی سمجھا جاتا ہے۔

سوائے نیک ارادے کے۔"

اور نیک ارادے کی تعریف (DEFINITION) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ:۔

"وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (DUTY) ہے۔"

یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہو کر، فرض کو محض فرض سمجھ لینا، کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصور شامل ہو جائے وہ عمل، عملِ خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عملِ خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک۔ اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادۂ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادّی اصول (MATERIAL MAXIMS) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادۂ عمل کریں۔ ان کا نام ان کی اصطلاح میں (APRIORI MAXIMS) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر فرض (DUTY) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امرِ غیر مشروط (CATEGORICAL IMPERATIVE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"امرِ غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو، بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔"

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے، تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے فرائض ہیں انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے، نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے "فرائض" ہونے کے لئے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے (APRIORI) کے یہی معنی ہیں) اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ابھار سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے۔ اس کے لئے کسی بڑے جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان "مفادِ خویش" کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا، جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا اربابِ تصوف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو "مفادِ خویش" سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے، زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رُو سے زندگی کے دو نظریے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے، اسے موت کہتے ہیں اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ زندگی کے مطابق انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا اور انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے رہ جاتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں کو مل جُل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوسائٹی ایسے قوانین وضوابط مرتب کرتی رہتی ہے جن سے ان تصادمات کا امکان کم ہو جائے۔ جو شخص ان قوانین وضوابط کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُسے پُر امن شہری کہا جاتا ہے، جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے

(i) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین وضوابط مناسب سمجھے، وضع کر لے اور جب چاہے ان میں تغیر و تبدل یا حک واضافہ کر لے۔

(ii) ان قوانین وضوابط کے اتباع کے لئے جذبۂ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا

(iii) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر لے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے، تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(iv) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی، لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفاد خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رَو میں بہہ نکلے، تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افرادِ قوم کو اس لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبۂ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔

اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گذر رہی ہے، اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصور ہے۔ اسے سیکولر نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لئے عذاب بن رہی ہیں اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا، وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (DEFINITION) کی رُو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصورِ حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو، تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ منفعت اندیشی کہیں گے، کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتّٰی کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے، تو وہ بھی اپنے ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی)۔

دوسرا تصورِ حیات

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب۔ قرآن کی رُو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ چونکہ اس کی نشوونما کے لئے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے، لیکن جسمانی نشوونما، ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟ ..... آپ دیکھیں گے انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلّت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جسے قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی، وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرّہ کی زندگی میں قدم قدم مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھئے کہ وہ بیٹے کی پیدائش کے لئے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا، تو میرے گھر کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ میرا نام و نشان مٹ جائے گا، میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا، میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے۔

اولاد کی اپنی زندگی۔ اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے، تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ——— انسان کو حیاتِ جاوید، انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

پھر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما، جسم کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے، تو اس کے اندر مضمرِ حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کر لے لیکن اس کے لئے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ جونہی وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، یعنی بچہ بن جاتا ہے، خول کی ضرورت نہیں رہتی، وہ ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور اس کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بچے کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات نشوونما کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ ذات کی نشوونما کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصورِ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویۂ نگاہ) میں جو سیکولر تصورِ حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(i) سیکولر تصورِ حیات کی رُو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لئے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی قوانین اور اقدار۔ لیکن

(ii) قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ایک بلند مقصد (استحکامِ ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں اور دونوں میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔

(iii) قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضے یا مستقل اقدار کے تقاضے) میں ٹکراؤ ہوتا ہے، تو وہ ذات کے تحفظ کے لئے جسمانی

تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش ذریعے کو بچانے کے لئے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا، تو ہر چند عام حالات میں کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا، تو اس نے جان کی خاطر، ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(۱۷) قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضا اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل قدر کے تحفظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا، خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو "عقلِ خود بیں" اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو "عقلِ جہاں بیں" کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن، طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیٰوۃ الدُّنیا) کے مفاد اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضا ہوتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفادِ خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے، تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطح زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے ..... انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔

(۱۹) جو کام عقلِ خود بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقلِ جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے، اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔ چونکہ سیکولر نقطۂ نگاہ کی رُو سے طبعی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لئے ان کی زبان میں عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں کے لئے الگ الگ الفاظ ہی نہیں تھے۔ اب ماہرین علم النفس بلکہ علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHC ANALYSTS) نے دو الگ الگ اصطلاحات وضع کی ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسان طبعی تقاضوں کے حصول اور ان کی تائید میں دلائل فراہم کرے۔ وہ اسے (RATIONALISING ANALYSTS) سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری وہ عقل جو انسانی نفس کے حق میں دلائل فراہم کرتی ہیں، وہ اسے (REASON) کہہ کر پکارتے ہیں۔ اقبالؒ نے ان کے لئے پہلے ہی دو اصطلاحات وضع کر دی تھیں۔ اوّل الذکر کے لئے "دانشِ برہانی" اور ثانی الذکر کے لئے "دانشِ نورانی"۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب تک انسان اس تصورِ حیات پر ایمان نہ لائے۔ (اس کی صداقت کا

یقین نہ کرے) کہ:۔

(i) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصودِ زندگی ہے۔

ایمان کی ضرورت

(ii) ذات کی نشوونما کے لئے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لئے ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں ـــــ اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اُس وقت تک اُس کا کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرفِ انسانیت سے ہے۔

راشڈل لکھتا ہے کہ مستقل اقدار ماننے کے لئے

(۱) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلامقصود نہیں پیدا کی گئی، بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

(۲) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

ا۔ ایک مستقل حقیقت ہے۔

ب۔ اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔ یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

ج۔ یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(۳) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال "آج" ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اس صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لئے کہ اخلاقی آئیڈیل، نفس (MIND) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفسِ مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۲۰ ـــ ۲۰۰)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لئے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے پہلے "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجائیے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں ـــــ اس لئے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے ـــــ ایک کاروباری آدمی کچھ خلافِ قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کر لے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لئے لے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے ـــــ وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے، کبھی رشوت قبول نہیں کریگا۔ اس لئے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے گا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال و بہرکیف زیادہ گرانبہا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ فائدے کے لئے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے "مفادِ خویش" کے جذبہ کی تسکین بھی کس طرح ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کا جذبۂ محرکہ بھی "مفادِ خویش" ہی کا احساس ہوتا ہے۔

مفاد اور مفاد میں فرق

لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لئے کم فائدے سے صرفِ نظر کر کے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لئے کرتا ہے کہ یہ کسی کا "حکم" ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے، نہ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا ـــــ جس طرح زہر آلود پلاؤ کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا۔ اسے قرآن کی رُو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حُسنِ عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کئے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک 'مردِ مومن' حسنِ عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا، تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ (۱۰/۷۲) سے یہی مراد ہے[1]۔ عمل کوئی بھی ہو وہ بلا صلہ یا

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی تشکیل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے ـــ

(باقی اگلے صفحہ پر)

بلامعاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک قانون (مستقل قدر) یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے، وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لئے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ (قرآنِ کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہ طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے، تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا، تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کما لے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو کمیونسٹ ممالک میں

روس کی مشکل پیش آ رہی ہے۔ اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے اور یہی وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظامہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ:۔

(i) انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے ـــــ اور

(ii) ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو، اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لئے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے کس قدر تڑپ ہوتی ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہو تاکہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جسم کی پرورش کے لئے کھاتی ہے۔ لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے، تو وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک)

(سابقہ صفحے سے فٹ نوٹ) ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی بھی، خوشگوار اور آخری زندگی بھی خوشگوار۔

دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لئے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس ماں کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔ اس مثال میں فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لئے یہ کچھ اس جبلّی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر حیوانی ماں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو انسانی ماں کرتی ہے لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل و فکر کی رُو سے اور اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔ اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فردِ معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔ معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں[1]) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں گے اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس سے وہ تمام خرابیاں دُور ہو جاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراطِ زر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے..... نہ ہی وہ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) افراد کے پاس رہنے دیگا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادّی تصورِ حیات پر مبنی ہے۔ اس لئے اس میں وہ جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب

عملی طریق

---

[1] وہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے۔

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دے دے۔ یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا، نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصورِ حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں کمیونزم جس تصورِ حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تصورِ حیات کی رُو سے مادّی مفاد سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اس میں آپ زیادہ سے

نیشنلزم کا جذبہ

زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار کر افرادِ معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ (مغربی نظریۂ جمہوریت کی رُو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبۂ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آگئی، تو مجھے قومیں ہڑپ کر جائیں گی۔ اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظِ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیئے۔ تحفظِ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظِ خویش کے لئے الانفک۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظِ خویش کے لئے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے، تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہیئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ کہا جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھا ہوا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو، تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔ جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔ لہٰذا، نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفادِ خویش پر ترجیح دیتا ہے، تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائیگا (جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لئے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے، تو اسے عقلمند کہا جائے گا) صاحبِ کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لئے دریا میں کود جائے اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس و شعور بھی نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت

سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے یا ان کا جذبۂ محرکہ کچھ اور تھا۔ صاحبِ کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لئے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کر دے۔ یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کمیونزم یا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں

مردِ مومن کا جذبۂ تحفظِ وطن

کرتے، تو اس لئے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہو جائیگا بلکہ اس لئے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کا تحفظ اس لئے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر وہ ملک کی حفاظت و استحکام کے لئے ذاتی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے، تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبۂ تحفظِ وطن اور ایک مومن کے جذبۂ تحفظِ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے؟ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ و تنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہو جاتا ہے جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصودِ زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ و استحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ و استحکام کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مملکتِ پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ اس میں ایسا نظامِ زندگی قائم کیا جائے جس سے افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مملکت کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس سے اگر طبیعی مفاد (سیاسی، معاشی وغیرہ مفادات) حاصل ہوتے تھے، تو وہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہو سکتا تھا جن کا زاویۂ نگاہ قرآن ہو۔ یعنی جو انسانی ذات اور اس کی نشوونما کو اپنی زندگی اور اس مملکت کا مقصود و منتہیٰ سمجھیں۔ مملکت کے اقتدار کا اس پارٹی یا اُس پارٹی کے ہاتھ میں ہونے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مملکت کا اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کو زندگی کا مقصد! اگر ایسا نہیں، تو حکومتوں کی تبدیلی اور پارٹیوں کے ردّ و بدل سے وہ مقصد کبھی حاصل

نہیں ہوسکے گا جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وہ حضرات ہوں گے جنہیں صاحبِ کردار (کیریکٹر والے لوگ) کہا جائے گا اور انہی کے برسرِ اقتدار آنے سے معاشرہ کی ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ ہوسکے گا۔ یہ چیز مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے جو راہ نما برسرِ اقتدار آتے رہے ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ و رسم تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری موجودہ قوم جیسی تیسی بھی ہے اس کے ذمے تو صرف یہ فریضہ عائد کیا جائے کہ اس خطۂ زمین کو محفوظ رکھیں۔ لیکن آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ قرآنی تصورِ حیات ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس طرح وہ ایک مثالی صاحبِ کردار قوم بن کر اُبھرے۔ مجھ سے اتفاق تو ان سب نے کیا لیکن (افسوس کہ) عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔ ہار تھک کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ (محدود پیمانے پر ہی سہی) جو کچھ مجھ سے بن پڑے مجھے خود ہی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آج دس بارہ سال قبل ایک ایسی درسگاہ کے قیام کا مقصد بنایا گیا جس میں یونیورسٹی کے نصاب کے ساتھ قرآنی تصورات کو پیوست کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنے کا تھا۔ زمینداروں سے اپنے طور پر زمین خریدنے کا پہلا معاملہ ہی فریب انگیز ثابت ہوا تو حکومت سے درخواست کی گئی کہ ہمیں قیمتاً زمین (ACQUIRE) کر دے۔ اس کے لئے قریب چار لاکھ روپیہ حکومت کے خزانۂ عامرہ میں جمع کرایا گیا۔ یہ اسکیم اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لے لینے کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ درس گاہ (کالج) کے بجائے قرآنک ریسرچ سنٹر قائم کر لیا جائے، جس میں فارغ التحصیل طلبار کی تربیت اس نہج پر کی جائے۔ خدا خدا کر کے حکومت کے قواعد و ضوابط کے مراحل طے ہوئے اور زمین کا قبضہ ملنے میں چند ماہ باقی تھے کہ (سابق چیف منسٹر، پنجاب) نواب صادق حسین قریشی کو وہ رقبہ پسند آگیا لیکن چونکہ قاعدے کی رُو سے وہ اس زمین کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری ساری اسکیم ہی منسوخ قرار دے دی گئی۔ ہم نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ دو سال کی طویل مدت کے بعد (حال ہی میں) اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا۔ لیکن قریشی صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت کے لئے درخواست گذران دی ہے۔ ان سطور کی تسوید تک پوزیشن یہ ہے۔

اگر ہمیں یہ زمین مل گئی (اور چونکہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی اجازت کا اعلان کر دیا ہے)، تو میں اپنی اسکیم کے مطابق درسگاہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر عمر کے اس آخری حصہ میں میری یہ آرزو پوری ہو جائے تو میں بحضورِ ربّ العزت سجدہ ریز ہوں گا۔

وَمَا توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم

۳ جنوری ۱۹۷۸ء

پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ڈاکٹر سید عبدالودود

"جمہوریت نہیں خلافت"

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مضمون "جمہوریت نہیں خلافت" نظر سے گذرا۔ یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت، مورخہ ۲۲ تا ۲۷ اکتوبر پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے "اللہ تعالیٰ کی حاکمیت" میں، "عوام کی حاکمیت" کی پیوندکاری کی کوشش کی ہے اور "خلیفۃ اللہ" اور "اللہ کے اختیارات کی تفویض" جیسے فرسودہ نظریات پیش کئے ہیں۔ چونکہ اس مضمون میں نظامِ اسلام کے نفاذ کی رُو سے بعض بنیادی مسائل سامنے آئے ہیں، اس لئے میں ان پر تبصرہ کرنے سے پیشتر گذارش کروں گا کہ ہر وہ مسئلہ جس کی وضاحت کا انحصار آیاتِ قرآنی پر ہو، اسے بیان کرتے وقت الفاظِ قرآنی کو سامنے لانا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہو سکتا ہے کہ بیان کنندہ اپنے بیان میں ایسے خود تراشیدہ تصورات پیش کرتا جائے جن کا قرآن کے متن کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہ ہو اور اس طرح یہ بیان موچی دروازے کی تقریر بن کر رہ جائے یا کسی ایسے خطیب کا جمعہ کا خطبہ بن کر رہ جائے، جو غیر ضروری مسائل اس لئے پیش کرتا چلا جائے کہ اس موقع پر اسے کوئی ٹوک نہیں سکتا۔

سب سے پہلے میں یہ گذارش کروں گا کہ مملکتِ پاکستان میں اس وقت سیاسی، معاشرتی، معاشی اور نفاذِ اسلام کے مسائل نے ایسی صورت اختیار کر رکھی ہے کہ "ظھر الفساد فی البرّ و البحر" کا سماں نظر آتا ہے۔ ہر طرف سے اعتراضات اور اخبارات میں تبصروں کی بوچھاڑ شروع ہے لیکن نفاذِ اسلام پر تبصرہ نگاروں کی نگاہ پاکستان میں صرف اسلام کے پودے کے مرجھائے ہوئے زرد پتوں تک جاتی ہے، اس پودے کی جڑ تک، جو کہ دیمک زدہ ہو چکی ہے، نہیں پہنچتی۔ کوئی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ مملکتِ پاکستان میں نہ گذشتہ ۴۴ برسوں میں نظامِ اسلام کا نفاذ ممکن ہو سکا اور نہ آئندہ ہو سکے گا جب تک کہ مملکت کے آئین کی بنیادی غلطیوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ ان بنیادی غلطیوں کی وجہ سے ہر صاحبِ اقتدار نے قانون سازی میں من مانی کی۔ مثال کے طور پر صدر ضیاء الحق مرحوم نے آئین کی شق ۸۹ کی رو سے اللہ کے تفویض کردہ اختیارات کو استعمال کر کے اگر بھینس کو گینڈا کہہ دیا، تو کسی کو پوچھنے کا حق حاصل نہ

رہا کہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس مفروضہ کے تحت کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اختیارات صدر مرحوم کو تفویض ہو چکے تھے، ہر معاملے کا حل درست ہو یا غلط، ان کے دستِ قدرت میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کے اختیارات کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔

اقتدارِ اعلیٰ

اقتدار کا مسئلہ بنیادی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مغربی جمہوریت اور اسلامی نظام کا فرق بیان کرتے ہوئے یہاں تک تو درست فرمایا کہ مغربی جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بیان کرنے میں کہ "نظامِ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے اختیارات کی شکل کیا ہوتی ہے اور اس کے حدود کیا ہیں"، ڈاکٹر صاحب بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ چنانچہ اقتدارِ اعلیٰ کے مسئلہ پر غور و فکر کرنا لازمی ہے۔ جب تک یہ مسئلہ صحیح سمت اختیار نہیں کرتا، مملکتِ پاکستان میں نفاذِ اسلام ناممکن ہے۔

اسلامی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے یعنی ان قوانین، احکامات اور مستقل اقدار کو، جو قرآنِ کریم کے صفحات میں موجود ہیں اور جن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

اسلامی مملکت کے حکمران صرف ان احکام و قوانین کو نافذ کرنے کی مشینری ہوتے ہیں جو حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے وحی کے ذریعے امتِ مسلمہ تک پہنچے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔ ان الحکم الا للہ (۱۲/۴۰) "یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا مالک صرف اللہ ہے"..... وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝ (۱۸/۲۶) "اس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کیا جا سکتا"۔ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ صرف اس کی کمانڈ کے تابع ہوتا ہے۔ مظاہرِ فطرت یا خود انسانوں میں سے کسی کو انسان سے برتر سمجھ کر خدائی اختیارات میں شریک کر لینا اور خود اپنے آپ کو اس سے فروتر سمجھ لینا ظلم ہے۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خدا کے علاوہ، انسان سے برتر کوئی نہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔

..... وَ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝ (۱۸/۱۱۰)

"اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کرے"۔

لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو براہِ راست حکم نہیں دیتا بلکہ یہ احکام، وحی کے ذریعے انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا.....

(۶/۱۱۵)

ان سے پوچھو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین بھیجا ہے۔"

چنانچہ ایک اسلامی مملکت میں، اقتدارِ اعلیٰ، کِتٰبَ مُفَصَّلًا (قرآنِ کریم) کو حاصل ہے اور اسلامی مملکت کی مشینری صرف قرآن کے احکام نافذ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے خود اپنے احکام نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ پھر کہا:

.... فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ

"اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کرو (اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے پیچھے مت چلو۔"

چنانچہ اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی، احکامِ خداوندی (جو قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں) کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ اس مرکزی اتھارٹی کی اطاعت افرادِ امت کے لئے لازمی ہے جس کے نتیجے میں افراد میں وحدتِ عمل کا وجود میں آنا لازمی ہے اگر کہیں ملت کے افراد میں وحدتِ عمل نہیں پائی جاتی، تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ یا تو افراد، مرکزی اتھارٹی کے احکام کا اتباع نہیں کرتے یا مرکزی اتھارٹی، اللہ کے احکام جاری کرنے کی بجائے، خودساختہ قوانین جاری کر رہی ہے۔ چنانچہ اللہ پر ایمان، قوانینِ خداوندی (جو اللہ کی کتاب کے اندر موجود ہیں) کا نفاذ اور ان احکام کو نافذ کرنے والی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، اس سلسلے کی کڑیاں ہیں، جن سے اُمت میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم مرکزی اتھارٹی کی اطاعت پر زور دیتا ہے، لیکن مرکزی اتھارٹی، اگر اللہ کے قانون کی بجائے، انسانوں کے خود تراشیدہ تصورات نافذ کرنے بیٹھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ انتشار ہو گا اور مملکت میں نظامِ اسلام کا نفاذ ناممکن العمل شے بن جائے گا۔ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی تفویض کا نظریہ قطعاً غلط اور غیر قرآنی ہے۔ جب تک پاکستان کے آئین سے تفویض کا لفظ خارج نہ کیا جائے اس وقت تک اس مملکت میں دینِ اسلام کا نفاذ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس سے ہر وہ شخص جو برسرِ اقتدار آئے گا، اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو ذاتی اقتدار میں بدل کر رکھ دے گا۔ تفویض کے تصور نے عیسائیت میں جنم لیا جہاں یہ پاپائیت کی بنیاد بنا۔ عیسائی بادشاہوں نے اسی میں ترمیم کر کے "ڈِوائن رائیٹس آف کنگز" کی بنیاد رکھی۔ اس سے بادشاہوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور عملی طور پر رواج پا گیا اور جب مسلمانوں میں 'خلافت'، ملوکیت میں بدل گئی، تو مسلمان بادشاہوں نے اس تصور کو اپنا لیا کیونکہ یہ ان کے ذاتی مفاد میں تھا اور وہ اپنے آپ کو ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ زمین پر خدا کا سایہ تصور کرنے لگے۔ اس کے بعد مسلمان بادشاہوں نے دنیاوی امور اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور دینی معاملات مذہبی پیشواؤں کے سپرد کر دیئے۔ جب تک ملوکیت قائم رہی، یہ پاپائیت کا سہارا لیتی رہی اور پاپائیت، ملوکیت کے بل بوتے پر قائم رہی۔ یہ گٹھ جوڑ مسلسل جاری رہا، جس کے نتیجے میں دینِ اسلام (جو حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی

قوانین کے تحت رائج کیا تھا اور جس میں مرکزی اتھارٹی، قرآنِ کریم کے قوانین دستقل اقدار کے نفاذ کی ذمہ دار تھی (نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔

برّ ِصغیر میں غیر مسلموں کی حکمرانی کے بعد، علامہ محمد اقبالؒ اور پھر قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے پھر سے دینِ اسلام کی بنیاد پر مملکت کے قیام کا بیڑہ اٹھایا۔ جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے، دین کی بنیاد پر مملکت کے قیام میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ امورِ مملکت میں اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو عملاً نافذ کیا جائے۔ قائدِ اعظمؒ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا؛

"اسلامی مملکت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمنٹ کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود مقرر کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔"

مملکتِ پاکستان کے بانیوں نے علی الاعلان کہا کہ یہاں پاپائیت رائج نہیں ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ملوکیت کے کندھوں پر سوار، پاپائیت کا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔ اختیارات تفویض کرنے کا تصوّر قطعاً غیر قرآنی ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے، زیدؔ اپنے اختیارات بکرؔ کو تفویض کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اختیارات کا قطعی استعمال، بکرؔ کے ہاتھ میں رہے گا۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے جس طریق سے چاہے، ان اختیارات کو استعمال کر سکے گا۔ اس دوران زیدؔ کا ان اختیارات پر کنٹرول معطل رہے گا۔ اس میں دوسرا نقطہ یہ ہے کہ ایک اتھارٹی کا دوسری اتھارٹی کو اختیارات تفویض کرنے کا طریقہ اس وقت آتا ہے جب تفویض کرنے والی اتھارٹی غیر حاضر ہو لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ اس کے کسی وقت یا کسی موقع پر غیر حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات نہ صرف کسی کو تفویض نہیں کرتا بلکہ ان میں کسی دوسرے کی شراکت بھی قبول نہیں کرتا، حتّٰی کہ انبیائے کرام کو بھی نہیں، جو خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہوتے ہیں۔

اب اس بات پر غور کیجئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کی تفویض کے لئے کس قسم کی من گھڑت کہانی بنائی؟ مُلّا کہتا ہے کہ انسان، خلیفۃ اللہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کی اتھارٹی (اقتدار و اختیار) کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ جب کہ قرآن میں کسی ایک جگہ بھی انسان کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا گیا۔ جب اللہ نے ملائکہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَه "میں روئے زمین پر خلیفہ کی تخلیق کرنے والا ہوں" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ روئے زمین پر جو پہلی نسلیں (تخلیقات، مخلوق) یکے بعد دیگرے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آرہی ہیں، میں ان کے جانشین کی تخلیق کرنے والا ہوں۔ اس نقطہ کی وضاحت کہ انسان خلیفۃ اللہ نہیں، از روئے قرآن کی جاتی

ہے۔ لفظ خلیفہ کا مادہ ہے خ۔ل۔ف۔ اس مادہ میں تین بنیادی تصورات ہیں۔ (i) ایک کے بعد دوسرے کا آنا (ii) ایک کا دوسرے کے پیچھے پیچھے چلنا اور (iii) تبدیلی واقع ہونا ــــ قرآنِ کریم اپنے یہ مطالب خود واضح کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً ..... ۝ (۲۵/۶۲)

"(اور جس نے خارجی کائنات میں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ) رات اور دن ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں"

بکر، زید کا خلیفہ، صرف اس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے، زید (چاہے زندہ ہو یا مُردہ) کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اب دیکھئے اس نظریہ کی تائید میں قرآنِ کریم کیا کہتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ پہاڑ پر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے گئے، تو انہوں نے جانے سے پہلے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا..... وَ قَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ ..... ۝ (۷/۱۴۲)

"پھر ایسا ہوا کہ موسیٰؑ ہمارے حکم سے ایک ماہ دس دن کے لئے الگ ہوا (تو اس نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری عدم موجودگی میں میری جانشینی کرو"

ایک دوسری جگہ کہا گیا:۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۴)

"ان اقوامِ سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا کہ یہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو"

ہودؑ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:۔

وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۝ (۱۱/۵۷)

"(اب تم دیکھو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات کس طرح تمہیں تباہ و برباد کر کے تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آتا ہے"

قومِ عادؑ کے متعلق کہا گیا:۔

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ۝ (۷/۶۹)

"(تم سوچو کہ قومِ نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اس لئے کہ اس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی)۔ اس کے بعد اللہ نے تمہیں اس کا جانشین بنا دیا"

چنانچہ قرآن کریم صاف الفاظ میں واضح کرتا چلا جا رہا ہے کہ بکرؔ زیدؔ کی عدم موجودگی میں یا اس کی موت کے بعد ہی اس کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی انسان، اللہ کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور موجود ہے۔ لفظ خلیفۃ اللہ، ان لوگوں کی ایجاد ہے جو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے نام پر، عوام الناس کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا، تو انہوں نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں، بلکہ خلیفۃ الرسول ہوں۔ چنانچہ استخلاف فی الارض کا مطلب، اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قوانین کو امورِ مملکت میں عملاً نافذ کرنے کے لئے اقتدار حاصل کرنا ہے۔ ایک اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور مستقل اقدار کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین غیر متبدل ہیں..... وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ..... ۵ (۶/۳۴) "خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی ردّوبدل نہیں کر سکتا۔" حتیٰ کہ انبیائے کرام بھی اس کے مجاز نہیں۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ..... ۵ (۳/۱۲۸) "(اے اللہ کے رسولؐ) اللہ کے قوانین بدلنے کا تمہیں اختیار نہیں دیا گیا۔"

اللہ، اَلٌ، اِلٰہٌ ہے۔ یعنی صرف اسی کی ذات صاحبِ اقتدار ہے۔ اسی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور بنی نوع انسان کے لئے اس کے قوانین کا اتباع لازم ہے۔ دین کی عبارت 'الٰہ' کے صحیح مفہوم پر استوار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق، واحد حکمران ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
"حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آزری"

ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
(۱۶/۵۱)

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، دیکھنا تم کہیں دو الٰہ نہ بنا لینا، الٰہ وہی ایک ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے اختیارات تفویض کرنے کا مطلب ایک سے زیادہ الٰہ بنا لینا ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں مومنین کی مرکزی کمانڈ صرف اللہ کے غیر متبدل قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور قانون سازی میں اس کا دائرۂ اختیار، ان غیر متبدل قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، صرف جزئی قوانین بنانے تک محدود ہے اس لحاظ سے اسلامی مملکت کے قوانین، متبدل اور غیر متبدل عناصر کا حسین امتزاج ہیں۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی، غیر متبدل قوانین و مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جزئی قوانین بناتی ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت کے قوانین کا یہ حصہ جو باہمی مشاورت سے طے پاتا ہے "متبدل" ہوتا ہے۔

قرآن و سنّت

اب آیئے اس مسئلہ کی طرف جس میں کہا جاتا ہے کہ شریعت سے مراد، اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآنِ پاک اور سنّت میں مرقوم ہیں۔ اس کے متعلق جو کچھ میں بیان کرنے لگا ہوں، اسے پڑھ کر مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں بہت لمبے چوڑے مباحث ہو چکے ہیں۔ میرے ذہن میں اس مسئلہ سے متعلق ایک قسم کا اشکال و ابہام موجود تھا اور جن احباب سے میں نے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا، انہیں بھی کم و بیش اس اشکال میں مبتلا پایا۔ ۱۹۵۹ء میں آئین کمیشن کا سوال نامہ شائع ہونے کے بعد ۱۹ علماء کے متفقہ جوابات سامنے آئے۔ ان علماء کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہو۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۰ء میں، میں نے اس اشکال کے حل کے لئے ان علمائے کرام کی طرف رجوع کیا اور ایک خط کے ذریعے اپنے مقصد اور نقطۂ نظر کو پوری وضاحت سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میرے سوالات مندرجہ ذیل تھے:۔

(i) آپ کے نزدیک سنّت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح 'کتاب' سے مراد 'قرآنِ مجید' ہے، بعینہٖ اسی طرح سنّت سے کیا مراد ہے؟

(ii) کیا (قرآنِ کریم کی طرح) ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنّتِ رسول اللہؐ مرتّب شکل میں موجود ہو۔ یعنی قرآن کی طرح، اس کی بھی کوئی جامع و مانع کتاب موجود ہے؟

(iii) کیا سنّتِ رسول اللہؐ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآنِ مجید کا متن؟

(iv) اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں، تو جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآنِ مجید کی آیت ہے، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنّتِ رسول اللہؐ ہے یا نہیں؟

میرا خیال تھا کہ اگر ان علمائے کرام کی طرف سے میرے مختصر سے سوالات کے متعیّن اور اطمینان بخش جوابات موصول ہو گئے، تو ان کی اشاعت سے بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی اور فکری وحدت کے امکانات روشن ہو جائیں گے، لیکن ان حضرات میں سے صرف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے پیر و مرشد سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے ہی اپنی قلم کو حرکت میں لانا ضروری سمجھا اور وہ بھی اس طرح کہ واضح اور دوٹوک جوابات کی بجائے، انہوں نے میری توجہ اس مراسلت کی طرف دلائی جو ان کے اور جسٹس رحمٰن صاحب کے درمیان ہوئی تھی اور جو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۹ء اور دسمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ مودودی مرحوم نے مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ میں اس کا مطالعہ کروں کیونکہ میرے سوالات کا جواب اس خط و کتابت میں موجود ہے۔ اس مراسلت کو پڑھنے کے بعد میں مطمئن نہ ہو سکا، چنانچہ مزید وضاحت کے لئے، میں نے

مودودی صاحب کی خدمت میں چند اور سوالات پیش کئے۔ اس پر مولانا نے جوابی مراسلت کو طول طویل تحریروں کا اکھاڑہ بنا دیا۔ یہ مراسلت ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ہر شخص اب بھی دیکھ سکتا ہے کہ آیا مودودی مرحوم میرے ابتدائی سوالات اور بعد ازاں دلائل کا جواب دے سکے تھے یا نہیں۔ جو کچھ میں نے ان کی تحریروں سے اخذ کیا، وہ یہ تھا کہ دل سے مودودی مرحوم بھی یہی سمجھتے تھے کہ سنّت کی وہ پوزیشن نہیں، جو وہ ظاہر کر رہے تھے لیکن اس کے اعتراف کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے تھے اور اپنی اس کمزوری کو طویل نویسی، طعن و تشنیع اور استہزار کے گھناؤنے پردوں میں چھپانے کی مذموم کوشش کرتے رہے۔ میں نے مودودی مرحوم کے آخری خط کا جواب جنوری ۱۹۶۱ء میں بھیجا تھا، لیکن انہوں نے اسے شائع نہ کیا اور نہ ہی وہ متعین طور پر فرماتے تھے کہ وہ اسے کب شائع کریں گے۔ اس کے بعد بھی میں ان کو یاد دہانی کراتا رہا۔ آخر ایک لمبی خاموشی کے بعد، انہوں نے ۳ جون ۱۹۶۱ء کو مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں انہوں نے لکھا "اس سلسلۂ مراسلت کو بلا نہایت جاری رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کو اس خط کا جواب دینے کی بجائے، میں نے اس پر مفصل تبصرہ کر دیا ہے۔ آپ کا خط اور میرا تبصرہ، انشاء اللہ عنقریب 'ترجمان القرآن' میں شائع ہو جائیں گے۔ ان کو کتابت کے لئے دے رکھا ہے۔"

یوں مودودی مرحوم نے اپنے حواریوں کو مطمئن کرنے کی خاطر تبصرہ شائع کر کے مراسلت سے پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن میرے سوالات کا دوٹوک جواب آخر تک نہ مل سکا۔

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کے نزدیک سنّت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح کتاب سے مراد قرآن ہے، اسی طرح سنّتِ رسول اللہ سے کیا مراد ہے؟

اس کا جو جواب مودودی مرحوم نے دیا تھا، وہ مختصراً یوں تھا ــــــ "محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون ہے جو حاکمِ اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمدؐ سے ہمیں دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن جو لفظاً بلفظاً خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمدؐ کا اُسوۂ حسنہ یا آپ کی سنّت، جو قرآن کے منشاء کی توضیح کرتی ہے۔ محمدؐ خدا کے صرف نامہ بر نہیں، وہ اس کے مقرر کئے ہوئے راہنما، حاکم اور معلّم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشاء سمجھائیں۔ اس کے منشاء کے مطابق افراد کی تربیت کریں۔ پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرہ کی اصلاح کے لئے جدّوجہد کریں۔ پھر اس اصلاح شدہ معاشرہ کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھائیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟ آں حضرتؐ کا یہ پورا کام، جو ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپؐ نے سرانجام دیا، یہ سنّت ہے، قرآن کے ساتھ مل کر حاکمِ اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانونِ برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے۔"

یہاں تک مودودی مرحوم نے درست فرمایا۔ میرا دوسرا سوال تھا۔ کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود

ہے جس میں سنتِ رسولؐ مرتب شکل میں موجود ہو۔ یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہو!

مودودی مرحوم کا جواب مختصراً۔

"ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمدؐ کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز کے پہلے دن قائم ہوا' وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع واقع نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے تمام ادارے' اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد' طرزِ فکر' اخلاق و اقدار' عبادت و معاملات' نظریۂ حیات اور طریقِ حیات سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس میں اختلاف بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ ہے جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ وہ سنت جو ان طویل صدیوں کے دوران مسلسل جاری رہی۔ دوسری تاریخی حقیقت جو اتنی ہی روشن ہے یہ ہے کہ نبی کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ جاننے کی پیہم کوشش کرتے رہے کہ سنتِ ثابتہ کیا ہے؟ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسلٍ میراث میں ملے ہیں اور ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔"

اب دیکھئے کہ مودودی مرحوم نے میرے دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا۔

"وہ معاشرہ جو اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے اور تمام مسلمانوں کے عقائد' طرزِ فکر' اخلاق و اقدار' عبادات و معاملات' نظریۂ حیات اور طریقِ حیات میں جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے' وہ سنت طویل صدیوں کے دوران مسلسل جاری رہی ہے۔"

پھر مودودی مرحوم نے فرمایا۔

"حضورؐ کی سنتیں مسجد سے لے کر خاندان' منڈی' عدالت' ایوانِ حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے' جو حضورؐ کی زندگی ہی میں عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ کے عہد سے لے کر دورِ حاضرہ تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے۔"

اب یہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مودودی مرحوم کا مندرجہ بالا بیان کس قدر حقیقت سے دُور ہے۔ رونا تو اسی بات کا

ہے کہ وہ معاشرہ اور وہ ادارے جو حضورؐ نے قرآن کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے اپنی زندگی میں قائم فرمائے تھے، باقی نہیں رہے اور ان کو دوبارہ نافذ کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ پاکستان کے اندر جو حالت ہے، وہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ دیگر اسلامی ممالک پر بھی نظر دوڑائیے۔ کیا وہاں وہ معاشرہ اب کہیں موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ متنازعہ غیر قرآنی باتوں کو چھوڑ کر جس پر ہماری پیشوائیت کا انحصار ہے۔ حضورؐ کی سنّت کو بخود قرآن کے اندر تلاش کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

جو کچھ آج مسلم معاشرے میں ہو رہا ہے، کیا اسے دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں، اللہ پر ایمان بعینہٖ اسی طرح موجود ہے جس طرح یہ قرآن نے بیان کیا ہے۔ کیا آج مسلمانوں میں، قانونِ مکافاتِ عمل کا تصور موجود ہے؟ قرآنِ کریم نے کہا ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰)

"یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔"

اس لئے ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پاتا ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا، یہ اس کا اہم ترین جزو تھا۔ لیکن آج ذات پات، حسب نسب اور رنگ و نسل کے امتیازات نے مسلم معاشرے کا رنگ یکسر بدل دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں۔ لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا..... (۴۶/۱۹) "ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق مرتب ہوں گے۔" لیکن مسلم معاشرے میں، مدارج، اعمال کی بجائے دولت کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے پیدل یا تانگے پر بیٹھ کر آتا ہے، آپ کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر آتا ہے، تو آپ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ گاڑی کرائے کی ہے یا اپنی؟ اگر اپنی ہے تو دیکھا جائے گا، گاڑی کا ماڈل کون سا ہے۔ جو بہت قیمتی گاڑی میں بیٹھا ہو، اس کا درجہ بہت بلند سمجھا جائے گا۔ چاہے وہ سمگلر ہی ہو۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غلام اونٹ کے اوپر بیٹھا ہے اور آقا اونٹ کی مہار پکڑے چلا آ رہا ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا وہ عدل کی بنیاد پر تھا۔ یعنی تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کے لئے، اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کئے جاتے تھے اور سعی و عمل کے لحاظ سے، اس کے مدارج متعین کئے جاتے تھے۔ ان کی محنت کے مطابق ان کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کسی کے حقوق و واجبات کو سلب نہیں کیا جاتا تھا اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق ہوتے تھے جو سب پر یکساں طور سے نافذ تھا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ..... (۱۶/۹۰)۔ "یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔" کہاں ہے وہ نظامِ عدل، جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ آج اس عدل کا

کہیں شائبہ تک بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بڑ ہانکنا کہ آج بھی مسلم معاشرہ میں وہ نظامِ عدل موجود ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا، آسان بات ہے لیکن اگر موجودہ زمانے میں اپنے گردوپیش نظر ڈالی جائے، تو صاف نظر آئے گا کہ ایسا کہنا نرا پاگل پن ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٥ (۳/۷۸)

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ خدا سے ورے میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔"

حضورؐ نے جس زمانے میں معاشرہ قائم فرمایا تھا وہ "يَوْمُ الدِّيْنِ" تھا۔ مُلّا نے تو یوم الدین کو صرف آخرت پر اٹھا رکھا ہے۔ اس کے نزدیک یوم الدین کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں لیکن قرآن نے خود غیر مبہم اور واضح انداز میں بتا دیا کہ یوم الدین کیا ہے؟ کہا کہ:-

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ٥ (۸۲/۱۷)

"اور تمہیں کیا معلوم ہے کہ یوم الدین کیا ہے۔"

پھر قرآن خود اس کا جواب دیتا ہے کہ:-

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ٥ (۸۲/۱۹)

"یہ وہ دور ہوگا جس میں (ہر انسان اپنے اعمال کو سامنے دیکھے گا اور) کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اختیارات تمام کے تمام قوانین خداوندی کے لئے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف اسی کے قوانین کی ہوگی (یعنی وہ دور جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔"

لیکن آج مُسلم معاشرہ میں ہر طرف استحصالی قوتیں کارفرما ہیں۔ فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں نے انسانیت کو اپنے خودساختہ قوانین کے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔

یہ درست ہے کہ کوئی معاشرہ اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے، جب تک افراد پر کچھ پابندیاں عائد نہ ہوں۔ از روئے قانون یہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور اس قانون کی اصولی حدود، وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہوتی ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے قانون کی حکمرانی کی بنا پر معاشرہ قائم فرمایا تھا لیکن آج کہاں ہے اس قانون کی حکمرانی، جو وحی کے ذریعے حضورؐ کو ملا تھا۔ مسلم معاشرے میں آج جو قانون بھی رائج ہے وہ یا تو کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کے ذہن کی پیداوار ہے یا مذہبی پیشوائیت کا خود تراشیدہ ہے یا سرمایہ داروں، جاگیرداروں کا

عوام الناس کا خون چوسنے کا قانون ہے۔ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا، وہ نہ صرف عدل بلکہ احسان کی بنیاد پر قائم تھا لیکن آج کا مسلم معاشرہ جس میں عدل کا نام و نشان نہیں، اس میں 'احسان' کا تو نام لینا ہی بے معنی ہے۔ حضورؐ نے عدالتوں کے اندر جو نظام قائم فرمایا تھا، اس میں نہ حق اور باطل کو خلط ملط کیا جاتا تھا، نہ حق کو چھپایا جاتا تھا، نہ شہادت کو پوشیدہ رکھا جاتا تھا، گواہ کی گواہی کی بنیاد سچائی پر ہوتی تھی، چاہے شہادت، خود اس کے اپنے خلاف جائے یا اس کے عزیز و اقارب کے خلاف، مقدمہ چاہے غریب کا ہو یا امیر کا، خائن کی وکالت نہیں کی جاتی تھی۔ جو لوگ اپنے ضمیر کے خلاف جائیں اور جو گنہگار ہوں، ان کی وکالت ممنوع تھی۔ (۲/۴۳ ؛ ۴/۱۳۵ ؛ ۵/۸ ؛ ۴/۱۰۵ ؛ ۴/۱۰۷)۔ لیکن آج مسلم معاشرے میں جو عدالتوں کی حالت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ہر شخص شہادت دینے سے پیشتر حلف اٹھاتا ہے کہ وہ جو کہے گا سچ کہے گا اور اس کے بعد مسلسل جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے۔ اکثر صاحبِ استطاعت اشخاص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ پیسہ خرچ کریں اور سفارش کرا سکیں۔

حضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں افراد کے جسم اور ذات کی نشوونما کی ذمہ داری حکومت پر تھی۔ افراد کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا حکومت کے ذمہ تھا اور افرادِ معاشرہ کے لئے اپنی بنیادی ضروریات سے زائد خرچ کرنا منع تھا۔

حضورؐ نے خود نہ کوئی محل تعمیر کئے تھے نہ کوئی جائیداد چھوڑی تھی۔ لیکن آج کا مسلم معاشرہ ملاحظہ فرمایئے۔ ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں ایک طرف وہ لوگ بیٹھے ہیں جن کو دو وقت کی روٹی ملنا محال ہے۔ تن پر بوسیدہ کپڑے رہائش ایسے مکانات کے اندر جو حیوانات تک کے لئے مضرِ صحت ہیں۔ بیمار ہو جائیں، تو دوا کے لئے پیسے نہیں۔ ان کے بچوں کے لئے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ جن کے فلک بوس محلات کی تعمیر مسلسل جاری ہے اور ہر گلی کوچے اور سڑک پر جاری ہے۔ ان میں سے ہر ایک عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی اور محلات کی تعمیر میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوششوں میں مگن ہے۔ دیہات میں بڑے بڑے زمیندار خدا بنے بیٹھے ہیں۔ پاکستان کو چھوڑ کر، عرب ممالک کی طرف نگاہ دوڑایئے کیا آج وہاں وہی معاشرہ موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ کیا حضورؐ کے زمانے میں سرزمینِ حجاز پر ایسے لوگ موجود تھے جو ایک "باز" خریدنے پر لاکھوں روپے خرچ کرتے تھے اور یورپ کے ہوٹلوں میں جا کر عیش و عشرت کو انتہائی بلندیوں تک پہنچاتے تھے۔ مودودی مرحوم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آج منڈیوں تک میں وہ معاشرہ موجود ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا لیکن آج جس طریق سے منڈیوں اور بازاروں میں استحصالی قوتیں کارفرما ہیں اور جس طریق سے بنکوں میں 'سود' کا نام 'منافع' رکھ کر "ربٰو" کو جائز قرار دیا گیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ کیا یہ وہی معاشرہ ہے جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا۔ اس میں قرآنِ کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار، مملکت کے امور کی حدود متعین کرتی تھیں۔ صرف روزمرہ کے معاملات، زمانے کے حالات کے مطابق ان مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے لیکن آج مسلم معاشرے میں مستقل اقدار کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ قائم فرمایا تھا، اس میں امانت ان لوگوں کے سپرد کی جاتی تھی جو اس کے اہل ہوں۔ نظامِ مملکت کو چلانا سب سے بڑی ذمہ داری ہے جو کسی فرد یا افراد کو سونپی جا سکتی ہے لیکن آج اسلامی معاشرے میں حکومت الا ماشاء اللہ ہر جگہ نااہلوں کے سپرد ہے۔ ہر کس و ناقص، جو اسلام کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو، اسلامی مملکت کا سربراہ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ مودودی مرحوم نے فرمایا تھا کہ وہ تمام ادارے جو حضورؐ نے قائم کیے تھے، آج بھی اسی طرح قائم ہیں، ان میں کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔ چنانچہ حضورؐ کی سنت کوئی گمشدہ چیز نہیں ہے کہ آج اس کی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اس معاشرے کے معمولی خط و خال بھی بمشکل نظر آتے ہیں جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ حضورؐ کی سنت آج اگر کہیں مل سکتی، قرآن اور صرف قرآن کے اندر مل سکتی ہے جو خدائی تحفظات کے ساتھ اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ ہر قسم کی انسانی دست برد اور ارضی و سماوی حوادث سے محفوظ ہے۔ لیکن مودودی مرحوم مجھے اس بازار کی طرف کھینچتے تھے جس میں ہر ملّا نے، سنتِ رسولؐ کا الگ الگ ماڈل سجا رکھا ہے۔ جہاں وحدتِ امت گم ہے اور ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔ مودودی مرحوم اسی انتشار کو سنتِ رسولؐ کا منبع قرار دیتے تھے۔ دل میں وہ سمجھتے تھے کہ اس بازار میں سنتِ رسولؐ دستیاب نہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد خود انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ پاکستان میں قرآن و سنت کی بنا پر معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ (ایشیا، ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء) اس لئے یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

اسے پھر دہرائیے کہ میرا دوسرا سوال کیا تھا اور اس کا جواب مودودی مرحوم نے کیا دیا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ 'کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں سنتِ رسولؐ اللہ مرتب شکل میں موجود ہو؟ مودودی مرحوم کا جواب تھا کہ اس کا (سنتِ رسولؐ اللہ کا) کتاب کی شکل میں موجود ہونا ضروری نہیں۔ حضورؐ کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے پہلے دن قائم ہوا تھا، وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے۔ اب قارئین خود اندازہ لگائیں کہ وہ معاشرہ آج زندہ ہے یا نہیں اور اگر زندہ ہے تو کہاں؟

اب آیئے میرے تیسرے اور چوتھے سوال کی طرف! میرا تیسرا سوال یہ تھا کہ "کیا سنتِ رسولؐ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآنِ کریم کا متن اور چوتھا سوال یہ تھا کہ "اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں، تو پھر جس طرح یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآنِ مجید کی آیت ہے، اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنتِ رسولؐ اللہ ہے یا نہیں؟

مودودی مرحوم نے اس کا جواب دیا تھا کہ "بلاشبہ سنّت کی تحقیق اور تعیّن میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ایسے ہی بہت سے اختلافات، قرآن کے بہت سے احکام وارشادات کے معنے متعیّن کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات، اگر قرآن کو چھوڑ دینے کی دلیل نہیں بن سکتے، تو سنّت کو چھوڑ دینے کے لئے انہیں دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں، میں نے مودودی صاحب کو لکھا تھا۔ "اجی حضرت! متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لئے دین کی سند اور حجّت نہیں ہو سکتا! اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں، ان کے متن میں ہی اختلاف ہے۔ ایک فرقہ، ایک حدیث کو رسول اللہؐ کا قول مانتا ہے، تو دوسرا اس کے قولِ رسولؐ ہونے سے یکسر انکار کرتا ہے۔

مودودی مرحوم نے لکھا تھا کہ سنّتوں کے متعلق اس قسم کے اختلافات سے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہیں آتی۔ میں نے جواب دیا کہ "اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق بھی یہ کہہ دے کہ میں اسے خدا کا کلام نہیں مانتا، تو کیا اس سے اس کے ایمان پر کوئی آنچ آئے گی یا نہیں۔ اگر آنچ آئے گی، تو پھر قرآن اور حدیث کو یکساں وحی قرار دینا کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ کچھ سمجھا آپ نے کہ متن کے اختلافات اور تعبیرات کے اختلاف میں کتنا بڑا فرق ہے؟ لیکن آپ اسے کیا سمجھیں گے جو قرآن کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ "اگر احکام اخذ کرنے میں لوگوں کا اختلاف ہو، تو الفاظ میں اتفاق سے کیا فائدہ؟ آپ کی اس نرالی منطق کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے (معاذ اللہ) قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے میں ناحق اتنا اہتمام فرمایا۔ جب لوگوں نے اس سے مختلف تعبیرات لے لینی تھیں، تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا کہ الفاظ محفوظ ہیں یا نہیں۔ جس شخص کا قرآن اور اس کی حفاظت کی غرض اور فائدہ کے متعلق یہ ایمان ہو، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کس سطح پر گفتگو کی جائے؟ قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے سے اختلافات اس وقت پیدا ہوئے، جب دین، اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا، اس وقت تک امّت میں اس باب میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں امّت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے۔ جب پھر کبھی اس قسم کا نظام قائم ہوگا، تو تعبیرات کے اختلافات باقی نہیں رہینگے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہتے۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے، تو امّت میں، وحدتِ عمل کا امکان ہی باقی نہ رہتا، تاوقتیکہ کوئی دوسرا رسول آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ مودودی مرحوم طویل نویسی کے ماہر تھے اور الفاظ کو اس ترکیب سے سجاتے تھے کہ اصل مسئلہ الفاظ

کے انبار تلے دب کے رہ جاتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مودودی مرحوم نے آخر میں خود تسلیم کر لیا تھا کہ قرآن و سنت کی بنا پر پاکستان میں نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہی صورت اب بھی مسلسل جاری ہے۔

یاد رکھئے!

مملکتِ پاکستان میں دینِ اسلام رائج کرنا ناممکن ہے جب تک قرآن اور سنت کی صحیح پوزیشن متعین نہ کی جائے اور صحیح پوزیشن حسبِ ذیل ہے:۔

قرآنِ کریم ہمیں بنیادی قوانین اور مستقل اقدار مہیا کرتا ہے۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کے لوگ، باہمی مشاورت سے ایسے جزئی قوانین وضع کرنے کے لئے آزاد ہیں، جو ان کے زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہوں، یہ جزئی قوانین وقت کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ قرآن کے بنیادی اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ ایک اسلامی مملکت کے سامنے جب کوئی معاملہ درپیش ہو، تو اس کا لائحہ عمل حسبِ ذیل ہوگا:۔

(i) اس معاملہ کے متعلق دیکھا جائے کہ حاکمِ اعلیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر بنیادی اصول کیا دیا ہے!

(ii) زمانے اور مملکت کی ضروریات کو واضح طور پر متعین کیا جائے۔

(iii) فقہ اور احادیث کی کتابوں کے اندر، اس مسئلہ کی کوئی پہلی مثال پیش کی جائے، جو موجودہ مسئلہ کے متعلق ہو!

(iv) اگر یہ مثال موجودہ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو، تو اسے براہِ راست اختیار کر لیا جائے۔

(v) اگر یہ مثال موجودہ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق نہ ہو، تو اسے مناسب ترمیم کے بعد عملی شکل دی جائے۔

(vi) اگر کوئی مکمل یا نامکمل مثال دستیاب نہ ہو، تو موجودہ ضرورت کے مطابق قرآنِ کریم کے بنیادی نظریہ کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، نیا راستہ اختیار کر لیا جائے۔

یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس سے، مملکتِ پاکستان میں، ہر حکومت نے گریز کی راہ نکالی اور جس کے نتیجہ میں نامرادیوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہی اس مسئلے کا حل ہے لیکن اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ فقہ اور احادیث کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی قرآن کی طرح غیر متبدل اور اسی طرح دین کی بنیاد ہے جس طرح قرآن، تو کسی مملکت میں بھی نظامِ اسلام کا قیام قطعاً ممکن نہیں ہے۔

ہر مسلم فرقہ کے مطابق قرآن پاک اور سنت کی تشریح و تعبیر ہو گی

پاکستان کے آئین کے ایک اور شاہکار کی طرف آیئے۔ قرآن و سنت کے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے پاکستان کے دستور کے آرٹیکل (۱) ۲۲۷ میں مرقوم ہے کہ

"کسی مسلم فرقہ کے کسی شخصی قانون کے ضمن میں شریعت کی تشریح و تعبیر میں" قرآنِ پاک

اور سنّت" کے الفاظ سے مراد اس مسلم فرقہ کے مطابق قرآنِ پاک اور سنّت کی تشریح و تعبیر ہوگی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کے مطابق، اس ملک میں ایک قوم نہیں بستی، یہاں اقتدارِ اعلیٰ اللہ کے قوانین کو حاصل نہیں ہوگا بلکہ ایسے قوانین کو حاصل ہوگا جو مختلف فرقہ بازوں کے خود تراشیدہ ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرہ کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ اللہ ایک، اس کا قانون ایک، جو آخری رسولؐ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملا تھا۔ اس کا نتیجہ وحدتِ امت تھی اور امتِ مسلمہ کی مشینری کا ہر جزو میں باہمی موافقت تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "شرک" ہے۔ یعنی ایک خدائے واحد پر ایمان کی بجائے، مختلف خداؤں پر ایمان ہے۔ قرآن نے کہا تھا:۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ "اپنے پروردگار کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔" (۱۸/۱۱۰)

پھر کہا:۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (۳۱/۱۳)

"(اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا ہے) تم اس کے اقتدار میں کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

مختصر الفاظ میں:۔

(i) یہ ایمان رکھنا کہ وہ اختیارات جو اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہیں، وہ کسی اور ہستی کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں، شرک ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور شخص یا طاقت کے سامنے جھکنا اور اس کے قوانین کا اتباع کرنا، شرک ہے۔

(iii) چنانچہ ایسے قوانین کا اتباع، جو قرآنِ کریم کے قوانین کے خلاف ہوں، شرک ہے۔

(iv) خدائے واحد کے قوانین کے اتباع کا لازمی نتیجہ وحدتِ امت ہے۔ امت کا فرقوں میں بٹ جانا شرک ہے کیونکہ ہر فرقے کے قریب، قوانین کے اتباع میں، آخری اتھارٹی، اللہ کے بجائے کوئی انسان ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ ... ۝ (۴۳/۸۴)

"وہی اللہ ہے جس کا قانون خارجی کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی۔"

پھر کہا:۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ.....٥ (۲۱/۲۲)

اگر کائنات میں خدا کے سوا کوئی اور اللہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے قوانین، تو کائنات کا سلسلہ تہس نہس ہو جائے گا۔"

قرآنِ کریم نہ صرف یہ کہ معاشرے میں انسانوں کے خود تراشیدہ قوانین کے نفاذ کو، اللہ پر ایمان کی نفی قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی خواہشات کو خدا بنانے والوں کے متعلق کہتا ہے:۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ٥ (۲۵/۲۴)

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہش کو الٰہ بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے، تو خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے، تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟"

یہ ہیں قرآنِ کریم کے احکامات، ان لوگوں کے متعلق، جنہوں نے فقہاء، پیروں اور مرشدوں کو الٰہ بنا رکھا ہے اور جس کی وجہ سے پوری پوری اُمتِ مسلمہ فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔

قرآن کہتا ہے:

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠..... ٥ (۳/۱۰۲)

"(یاد رکھو! دین انفرادی مسلک کا نام نہیں، نہ گروہ بندیوں کے طریقہ کا) لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم سب کے سب بلا استثناء، اجتماعی طور پر اس نظام کے ساتھ محکم طور وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو۔ فرقہ بندی شرک ہے" (۳۲-۳۰/۳۱) اور پارٹی بازی عذاب (۵/۶۵)۔"

قرآن کہتا ہے کہ اے رسولؐ! ان فرقہ پرستوں سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ٥

(۶/۱۶۰)

"دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے، مختلف راستوں پر چلنے کا نام نہیں) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کر دو۔ وہی بتلائے گا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

یہ دیکھتے جایئے کہ امت کو فرقوں میں بانٹنے والوں کے متعلق قرآن کے کیا احکام ہیں اور ہمارے شریعت آرڈی ننس میں نہ صرف یہ کہ ان فرقوں کو تسلیم کیا جا رہا ہے بلکہ ان کو یہاں تک ڈھیل دی جا رہی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو اپنے اپنے فرقے کے قوانین کے تحت سرانجام دے سکتے ہیں۔ گویا ان کو 'اَلٰ' 'اِلٰہ' چھوڑ کر مختلف خداؤں پر ایمان رکھنے کی چھٹی دی جا رہی ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

"یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اس منزل کی طرف اُٹھے جو خدا نے تمہارے لئے تجویز کی ہے۔ تم اس کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کئے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شامل نہ کرو۔ اس سے خود تمہارے اندر پہلے وحدتِ عمل پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی اپنے اختلافات کو چھوڑ کر امتِ واحدہ بن جائیگی۔ (۲/۲۱۳)۔ یہی دین کا مقصود ہے۔ لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جاؤ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امتِ واحدہ بننے کی بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد، حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کا راستہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو! فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے۔ تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا۔"

(۴۲/۱۳ ؛ ۲۲/۵۳ ؛ ۶/۱۶۰ ؛ ۳/۴)

(ضمناً، اس سے لفظِ صلوٰۃ کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔ یعنی ایسے معاشرہ کا قیام جس کی بنیاد قانونِ خداوندی کا اتباع ہو۔ ہمارے مُلّا نے صلوٰۃ کے قیام کو صرف نماز پڑھنے تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نمازِ باجماعت بھی صلوٰۃ کا حصّہ

ہے اور بڑا اہم حصہ، لیکن صلوٰۃ کا مفہوم بڑا وسیع ہے)

یہ فرقہ بندی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ عقل و شعور کے باوجود، یہ مذہبی راہنما، کیوں امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تُلے رہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ:۔

وَ اٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۴۵/۱۷)

"جو ضابطہ، قوانین انہیں دیا گیا تھا وہ بڑا واضح تھا لیکن انہوں نے اس قسم کا علم (وحی) مل جانے کے بعد محض باہمی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے۔ یعنی ان کے اختلاف اور فرقہ بندی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جو تعلیم انہیں وحی کے ذریعے دی گئی تھی، اس میں کچھ ابہام اور التباس تھا، وہ تو بڑی واضح تھی۔ یہ اختلاف باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ان اختلافات کا فیصلہ دورِ قیامت میں ہوگا۔"

ازروئے قرآن، امتِ مسلمہ میں ہر قسم کی تفریق لعنت ہے۔ مذہبی فرقہ بندی تو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ اس وقت شروع ہوئی، جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی اور قرآن کے احکام و قوانین کے اتباع کی جگہ انسانوں کے خود تراشیدہ تصورات اور توہمات نے لے لی۔ لیکن سیاسی پارٹی بازی، دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اوّل الذکر بڑی لعنت ہے اور آخر الذکر نسبتاً چھوٹی۔ لیکن ہیں ہر دو ہی لعنت۔

طریقِ انتخاب، جماعتی یا غیر جماعتی

ہماری اکثر سیاسی پارٹیاں اور اخبارات جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے پُرزور مؤید ہیں۔ جماعتی انتخاب کے حق میں ان کی دلیل یہ ہے کہ مملکت پاکستان، قائدِ اعظم کے متعین کردہ سیاسی، جمہوری اور جماعتی طریقِ انتخاب کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی، اس لئے اس عمل کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ لیکن نہ معلوم یہ لوگ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان نے متحدہ ہندوستان میں جنم لیا اور ایسے وقت میں جب انگریز کا سیکولر نظام رائج تھا۔ اس وقت قائدِ اعظمؒ نے جو راستہ اختیار کیا وہ آئینی تھا، قطعاً درست تھا، عقلمندی پر مبنی تھا اور مسلمان من حیث القوم ایک جماعت تھے، غیر مسلم (ہندوؤں وغیرہ) کے مقابلہ میں۔ ہندی مسلمانوں کی کشتی کو گرداب سے نکالنے کا یہی واحد راستہ تھا۔ لیکن مملکت پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد، یہاں کوئی دوسری غیر مسلم جماعت نہ رہی، جو ان کے نفاذِ اسلام کے راستہ میں اور مسلمانوں

کی جماعت کے مقابلہ میں کھڑی ہو۔ اب وہ حالات جو متحدہ ہندوستان میں تھے، باقی نہ رہے۔ یہاں پر اب صرف مُسلم قوم یا جماعت یا اُمت ہے (قوم کے اندر تفریق کی اسلام اجازت نہیں دیتا) لہٰذا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ قائداعظمؒ کا عمل پارٹی بازی کی سند ہے۔ متحدہ ہندوستان میں قائداعظمؒ اور مسلم قوم نظامِ اسلام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت کے حالات کے مطابق پوری ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کو منظم کر کے ایک سیاسی جماعت، بمقابلہ غیر مسلم اقوام، میں تشکّل کیا اور آئینی جنگ لڑ کر، جس کی بنیاد، مسلمانوں کو من حیث القوم الگ تشخص دلوانا تھا۔ مملکت حاصل کی۔

اب آپ کو دو چیزوں سے سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

- پہلی چیز یہ ہے کہ پاکستان میں مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کو نیست و نابود کر کے اسلام کا نظام نافذ کیا جائے۔
- یا بصورتِ دیگر سیکولر نظام کو بحال رکھ کر مغربی جمہوریت کو بروئے کار لایا جائے اور اسلام کو، جیسا کہ ہمارا مُلّا چاہتا ہے، صرف نماز، روزے تک محدود کر دیا جائے۔

یہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر والا نظام نہ صرف غلط ہے بلکہ قوم کے مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔ گذشتہ ۴۴ برس میں اس نے جو بے یقینی، تذبذب اور بے رہروی پیدا کی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ جماعتی یا غیر جماعتی انتخابات کے حق میں جو مختلف دلائل اکثر دیئے جاتے ہیں، وہ بے معنی ہیں۔ اصل نقطہ جو فیصلہ طلب ہے، وہ یہ ہے کہ آیا پاکستان میں نظامِ مملکت اسلامی ہوگا یا سیکولر یعنی مغربی جمہوریت کا۔ اگر اسلامی نظام مقصود ہے، تو انتخابات غیر جماعتی ہوں گے کہ اسلام میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی اجازت نہیں اور اگر لوگ جماعتی نظام پر بضد ہیں، تو پھر کھل کر سیکولر نظام کو اپنا لیا جائے اور اسلام کا نام لے کر مغربی جمہوریت کو بروئے کار لانے کی منافقت کو ختم کیا جائے۔

یہ ہیں پاکستان کے آئین میں بنیادی نقائص جو گذشتہ ۴۸ سال سے نفاذِ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

یہ مسئلہ ہمارے سیاسی راہنماؤں کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس کے بغیر نفاذِ اسلام کا نام لینا محض وقت ضائع کرنا ہے اور عوام الناس کو دھوکا دینا ہے۔

قرآنی آئین کے بنیادی خط و خال

مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنی آئین کے چند نکات پھر مختصراً بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلامی مملکت کے امور میں، اقتدارِ اعلیٰ، صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ مملکت کی مرکزی اتھارٹی، اللہ تعالیٰ کے احکامات و قوانین کو، جو قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں، نافذ کرنے کی مشینری ہوتی ہے، اسے خود تراشیدہ احکامات نافذ کرنے کا اختیار نہیں۔

۲۔ مجلس آئین و قوانین ساز کے حدود: قرآنِ کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ

(۶/۱۱۶) .....

"تیرے ربّ کی بات صدق و عدل سے مکمل ہو گئی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔"

چنانچہ سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمنٹ کا ادارہ، قرآنی احکامات و اصولات میں حک و اضافہ کر سکتا ہے نہ ہی کسی قسم کی تبدیلی۔

پارلیمنٹ، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت کے لئے قانونی جزئیات اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق وضع کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی جمہوریت (کنٹرولڈ ڈیموکریسی) ہو گی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہو گا۔

۳۔ فیصلہ کن ادارہ:۔ اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ محض "درشنی ہنڈیاں" ہیں۔ یہ حضرات فقہ کی کتابوں کا ترجمہ تو کر سکتے ہیں، اسلامی آئین و قوانین مرتب نہیں کر سکتے۔ قرآنِ کریم کو اساس تسلیم کر کے اس کے مطابق، قوانین مرتب کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وفاقی شرعی عدالت بھی صلاحیت رکھنے کے باوجود، اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اسے اسلامی اور غیر اسلامی کے پرکھنے کا جو معیار دیا گیا ہے (یعنی کتاب و سنّت) اس معیار کی کمزوری، سنّت کا اختلاف ہے۔ صرف قرآن کو معیار مقرر کیجئے، پھر اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲)۔ اس کے تمام اصول، صاف اور واضح ہیں۔ چنانچہ اصل اصول یہ نہیں کہ کون سا ادارہ اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ قرآنِ خالص کو معیار قرار دے کر، جو نسا ادارہ جی چاہیئے مقرر کر دیجئے! وہ متنازعہ امور کا فیصلہ نہایت آسانی سے کر سکے گا۔ واضح رہے کہ میرے اس اصرار کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے (معاذاللہ) سنّتِ رسولؐ سے کوئی بیر ہے۔ سنّتِ رسولؐ سے بیر رکھنے والا تو مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ میرے اصرار کی وجہ عملی دشواری ہے۔ سنّت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے سنّت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ علاوہ ازیں، امّت کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کی رُو سے حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ فلاں بات، رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے یا نہیں۔ اس بنا پر معیار صرف قرآن قرار پا سکتا ہے جو بلاشبہ اللہ کا کلام ہے اور تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ البتہ اگر کسی نقطہ کی وضاحت مطلوب ہو، تو اس کا صرف ایک حل ہے کہ عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اختلاف رکھنے والے اپنی وکالت تو کر سکتے ہیں، جج کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔

۴۔ **نظامِ شوریٰ اکثریت**:۔ اسلامی مملکت کا نظام، شورائیت پر مبنی ہے یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری امت پر اور اس کا کاروبار افرادِ ملت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ قرآن نے صرف اصول دیا ہے۔ اس کی عملی شکل کیا ہوگی اس کا تعین خود کرنا ہوگا۔

۵۔ **مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں**:۔ قرآنِ کریم نے انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا ہے۔ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطہ، قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد ایک قوم اسی صورت میں بن سکتے ہیں جب وہ ایک ضابطہ، قوانین کی اطاعت کریں۔ دوسرے الفاظ میں قوم کی وحدت کا انحصار قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ بھی، امتِ واحدہ اسی صورت بن سکتی ہے کہ وہ ایک ضابطہ، قوانین کے تابع رہے۔ قرآنِ کریم میں نہ تو شخصی اور تمدنی قوانین کی تفریق کی گئی ہے اور نہ اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا تصور ہے۔ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کی رُو سے فرقوں کا وجود شرک ہے (۳۰/۳۱) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں۔ اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود از روئے قرآن شرک ہے اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی خلافِ اسلام ہے۔ قرآن نے اسے سیاستِ فرعونی سے تعبیر کیا ہے (۴/۲۸)۔

۶۔ **تشکیلِ حکومت**:۔ قرآنِ کریم حکومت کی شکل یعنی فارم آف گورنمنٹ سے بحث نہیں کرتا۔ وہ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل بھی چاہیں متعین کرلیں، بشرطیکہ وہ مشاورت کے اصول اور قرآن کی بالادستی سے نہ ٹکرائے۔ یہ اعلیٰ درجے کے پاکستانی قانون دانوں کا جو قرآن کی تعلیم سے بھی آگاہ ہوں، فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کے لئے فارم آف گورنمنٹ، باہمی مشاورت سے طے کریں۔ اسی طریقہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجوزہ "خلافت" کی صحیح شکل حالاتِ زمانہ کے مطابق سامنے آسکتی ہے۔ صرف جمہوریت کی جگہ خلافت کی اصطلاح کی تبدیلی سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمنٹ میں "حزبِ اختلاف" کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو اسلامی پارلیمنٹ کے ممبر ہی نہیں ہوسکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہوجانا جن میں سے ہر ایک کا مقصد، دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن امت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا، سراسر غیر اسلامی ہے۔

۷۔ **اصولِ اہلیت**:۔ ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے جو اصول مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ... (۴/۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت سپرد کئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کردو جو اس کے اہل ہوں۔"

اس اہلیت میں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رُو سے

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ..... ۵ (۴۹/۱۳) "تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے"۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے غافل ہوں اور اپنے ہی خیالات و جذبات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَ اتَّبَعَ ھَوٰىہُ وَ کَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا ۵ (۱۸/۲۸)

"تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو گیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گزر گیا"۔

اب قارئین خود اندازہ لگا لیں کہ پاکستان کے حکمرانوں میں یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والوں میں کتنے ہیں، جو قرآن کے مقرر کردہ اہلیت کے مطابق برسرِ اقتدار آئے، جس طریق سے ان کی اکثریت برسرِ اقتدار آئی وہ عیاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر کوئی اسلام کا نام لے کر قوم کو فریب دیتا رہا۔ حکمرانوں کے اسلام کا نام لینے کے باوجود قوم مسلسل استحصالی قوتوں کے جبر کے تلے پستی چلی جا رہی ہے۔ ہر جابر حکمران 'بسم اللہ' اسلام کے نام سے کرتا ہے اور پھر مسلسل اور پیہم اپنے خود تراشیدہ تصورات کے تحت قوم کو کچلتا چلا جاتا ہے۔

از روئے قرآن "کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی داخلی دنیا، اس کی نفسیات اس کی ذہنیت میں تبدیلی نہ ہو" (۱۳/۱۱) اور یہ تبدیلی لانے کے لئے قرآنِ کریم کے قوانین اور مستقل اقدار پر معاشرے کا قیام ناگزیر ہے۔ اصطلاحات کی تبدیلی اس کا حل نہیں۔ مملکتِ پاکستان کی موجودہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی صورتحال 'ظھر الفساد فی البرّ و البحر' کا سماں پیدا کر رہی ہے۔ قوموں پر جب یہ وقت آتا ہے، تو پھر اللہ کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آجایا کرتی ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰)

"ہم نے تمہاری طرف ایک ایسا ضابطہ قانون نازل کیا ہے جس میں تمہارے ہی شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر تم عقل و بصیرت سے کام لے کر سوچو!"

حضرت علامہ محمد اقبالؒ، عالمِ اسلام کے ایک عظیم اور منفرد فلسفی تھے۔ اپنوں نے تو انہیں ایک شاعرِ خوش نوا ہی جانا اور اپنے تئیں سب سے بڑے اعزاز "شاعرِ مشرق" کے لقب سے نوازا، لیکن مغرب نے جہاں اہلِ علم کی کچھ قدر شناسی ہوتی ہے، انہیں ایک فلسفی کے طور پر پہچانا اور دُنیا کے عظیم فلاسفروں کی صف میں انہیں اس مقام پر فائز کیا جس کے وہ حقدار تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک قلبِ دردآگیں رکھتے تھے۔ انہوں نے انسانیت کے دکھوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کی سب سے پہلی (نثر کی) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انسانی طرزِ عمل کو ایک بڑی حد تک متاثر کرنے والے عوامل کا ذکر کرنے کے بعد، انہوں نے سوال اٹھایا کہ:

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا ممکن نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟"

علامہ اقبالؒ نے ہر فلسفۂ حیات اور ہر نظامِ معیشت سے ان سوالات کا جواب لانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ انہیں ان کا جواب صرف قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے ملا۔ سب سے پہلے انہیں قرآن سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب نظامِ سرمایہ داری ہے، چنانچہ انہوں نے اس نظام کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضر سے سوال کرتے ہیں:۔

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور پھر خضر کی زبان سے خود ہی یہ جواب دیتے ہیں:۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

انہوں نے اس نظام کے حاملین، اہلِ مغرب کو للکار کر کہا کہ:۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، کل زرِ کم عیار ہوگا

بالِ جبریل میں "لینن خدا کے حضور میں"، لینن سے یہ شکایت کراتے ہیں کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تیری منتظر روزِ مکافات

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد "فاضلہ دولت" (SURPLUS MONEY) پر ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (۲/۲۱۹)

"اے رسول! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اپنی دولت میں سے کس قدر رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رکھیں! ان سے کہہ دیجئے جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔"

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب آیا تو اقبالؒ کی نگہِ دُوررس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دَور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام، وجہِ شادابیٔ عالم بن جائے گا۔ انہوں نے 'ضربِ کلیم' میں اشتراکیت کے عنوان سے اپنی نظم میں کہا:۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سُود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان — اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

لیکن اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کو بغور دیکھا، تو انہیں نظر آیا کہ اس کی بنیاد ہر چیز کی "نفی" پر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے یہ واضح کرنے کے بعد کہ

در مقامِ لا، نیا ساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں — نفیٔ بے اثبات مرگِ اُمتاں

روس کو یہ پیغام دیا کہ

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداوندان تمام — بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے

اور اسے بتایا کہ یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی۔ فرماتے ہیں:۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب

لیکن روس نے اقبالؒ کے اس پیغام کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور آخر کار اپنے اتنے عظیم نظامِ معیشت کے لئے اساسِ محکم نہ ملنے کی بنا پر، نظامِ سرمایہ داری کی سازشوں کا شکار ہو کر اسے ایک ہنگامی حادثہ بنا کر رکھ دیا۔ اگر روس کے معاشی نظام کو "اُمّ الکتاب" کی اساسِ محکم مل جاتی، تو انسانیت کا مقدر بدل جاتا لیکن ولے حسرتا! کہ ایسا نہ ہو سکا اور آج روس پھر نظامِ سرمایہ داری کے سامنے گھٹنے ٹیکے، ہاتھ میں بھکاری کا کشکول لئے درماندہ و واماندہ کھڑا ہے۔

مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کے گہرے مطالعہ کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس کے حاملین کو چیلنج دیا کہ:۔

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

اور اس نظام کے انجام کے متعلق انہوں نے آج سے بہت پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — کہ فرنگ راہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

آج آپ افرنگ کے تمدنی اور اقتصادی نظامہائے حیات پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ حضرتِ علامہ کی متذکرہ پیشینگوئی کس طرح حرفاً حرفاً درست ثابت ہوئی ہے۔ آج ان کے معاشرتی ڈھانچے (SOCIAL FIBRES) پارہ پارہ ہو چکے ہیں۔ ان کے ہاں متابل زندگی کا تصور رہا ہی نہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ازدواجی زندگی بسر کرنے کی بجائے (LIVING ARRANGEMENTS)

ے تحت ایک دوسرے کے ساتھ زندگیاں گذار رہے ہیں اور جب تک یہ LIVING ARRANGEMENTS انہیں موافق آتے
ں، وہ ساتھ رہتے ہیں۔ جب یہ ان کے راستوں کی رکاوٹ بن جائیں، تو وہ یہ جوا بھی اتار پھینکتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ایوان ہائے
عاشیات میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے جا رہے ہیں اور وہ اپنے تئیں تدبّر کی فسوں سازی کی پیوندکاری سے انہیں سہارا دینے کی کوششیں
ر رہے ہیں۔

چونکہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی مفلس و نادار انسانوں (HAVE-NOTS) کے استحصال (EXPLOITATION) پر اٹھتی ہے۔
س لئے یہ یا اس جیسا کوئی نظام بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ صرف اس نظام کو بقا حاصل ہو سکے گی جو ربّ العالمین کے ارشاد کے مطابق بنی
نوعِ انسان کی 'من حیث الکل' منفعت کا علمبردار ہوگا:۔

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ط (۱۳/۱۷)

تنہا عقلِ انسانی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کوئی ایسا نظام وضع کر سکے جس میں اس کے واضعین کے علاوہ کسی اور کی منفعت کا بھی
اہتمام ہو۔ ایسا نظام صرف اس سرچشمہ سے مل سکتا ہے جو سب کا خالق ہے سب کا رب ہے اور جسے اپنے لئے ہمارے ہاں سے کچھ
بھی نہیں چاہیئے، وہ صرف دیتا ہی دیتا ہے کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ وہ جو پورے حتم و یقین سے کہتا ہے کہ:

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ (۲۰/۵۰)

"وہ رب جس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، اسی نے یہ نظام بھی کر رکھا ہے کہ اُن اشیاء کو بتائے کہ
ان کی منزلِ مقصود کونسی ہے اور وہ اس منزل تک کس طرح پہنچ سکتی ہیں"۔

عقلِ انسانی اور اس سرچشمہ سے ملنے والی ہدایت (وحیٔ خداوندی) کا بڑا ہی خوبصورت تقابل حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اور آج اس روئے زمین پر وحیٔ حق، اپنی خالص، منزّہ، غیر محرّف اور مکمل ترین شکل میں صرف قرآن کریم کی دفتین میں ہے اور قیامت
تک، سب سے بڑھ کر حفاظت کرنے والے کی حفاظت میں محفوظ و مصئون:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

جب بھی کسی کا جی چاہے اس پر عمل کر کے دیکھ لے اسے وہ آسودگیاں اور فرحتیں مل جائینگی جن کا تصور بھی انسانی حیطۂ ادراک میں
نہیں آسکتا۔ قرآن کیا ہے اور کیا کر سکتا ہے اور تنہا عقلِ انسانی کے راستے میں کون کونسے سنگہائے گراں ہیں جو اسے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے روکتے
ہیں، ان کا نہایت ہی مدلّل اور خوبصورت جائزہ علامہ اقبالؒ کی قرآن فہمی سے کسب ضیاء کرنیوالے انہی جیسے ایک عظیم مفکّر علامہ غلام احمد پرویزؒ نے
اپنے اس مضمون میں پیش کیا ہے جو اُن کے "مفہوم القرآن" کا بابِ اوّل ہے اور جس کا عنوان ہے "القرآن العظیم"۔ ہم اسے عام استفادہ کے لئے
یہاں پیش کر رہے ہیں۔ بایں دعا کہ ربنا تقبل منّا انّک انت السمیع العلیم۔

محمد عمر دراز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القرآن العظیم

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

انسانی تاریخ کی عبرت سامانی

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ یہ' تعمیر و تخریب کی عبرت انگیز داستان' اور آبادی و ویرانی کی حدیث خونچکاں نظر آئے گی۔ ہر دور کے انسان کی جد و جہد اور سعی و کاوش کا ملخص یہ دکھائی دے گا کہ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس و کہکشاں گیر عمارت کے لئے انواع و اقسام کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت' اُس کے حسین تصورات کی مرکز۔ اس کی شاداب آرزوؤں کی محور اور گل پوش تمناؤں کی آماجگاہ بنتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ایوانِ رفیع الشان کی تکمیل میں ارتقائے انسانیت کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا وجود' دُنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے پناہ گاہ ہے جو اسے ظلم و استبداد کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے بچا کر' امن و سکون عطا کر دے گا۔ وہ ایک عرصہ تک اِن تصورات کی دُنیا میں محو اور اس قصرِ عظیم المرتبت کی تکمیل و تزئین میں سرگرداں رہتا ہے' اور جوں جوں اُس کی دیواریں اوپر کو اُبھرتی ہیں' اُس کی نگاہوں میں چمک اور مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے ـــــ لیکن وہ عمارت ہنوز تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اِس عبرت انگیز تماشے کو بصد حیرت دیکھتی ہے کہ وہی اِنسان' اُس عظیم و حسین عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے' اور یوں اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ شگفتہ و شاداب مرقع' خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے' اور' اُس کے بعد' اُس کے کھنڈرات' ایک حسین خواب کی پریشاں تعبیر کی نشاندہی کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان۔ چین اور ترکستان۔ روم اور ایران کی تہاذیب کے کھنڈرات کو دیکھئے اور پہچانئے کہ وہ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدنوں کے مدفن ہیں' جن میں انسانی ناکامیوں اور نامرادیوں کی تاسف انگیز اور جگر پاش داستانیں محوِ خواب ہیں ـــــ وہ داستانیں جو ہر قلب حساس سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (۱۶/۹۲)

دیکھنا! تمہاری مثال اُس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اگر آپ کو تاریخ کی ان کہنہ داستانوں کی ورق گردانی اور اقوامِ سابقہ کے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی عبرت سامانی سے انسانی سعی و کاوش کے اس مآل و انجام تک پہنچنے کی فرصت نہیں، تو ایک نظر خود اپنے زمانے کے قصرِ تہذیب و تمدن پر ڈالئے جس کی چمک دمک نے اقوامِ عالم کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ ہمارا دور تہذیبِ مغرب کا دور کہلاتا ہے۔ اِس تہذیب کی سطوت و شروت اور دبدبہ و طنطنہ کا یہ عالم ہے کہ انسان نے فطرت کی بڑی بڑی مہیب قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اسبابِ رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی محیر العقول برق رفتاری سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ سمندر اس کے تابعِ فرمان ہے۔ پہاڑ اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ زمین اس کے پاؤں کی ٹھوکروں سے اپنے دبے ہوئے خزانے اُگل رہی ہے۔ آسمان کی بجلیاں اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ ایٹم کی غیر مرئی جناتی توانائیاں اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ چاند اور سورج کو اپنے زیرِ دام لا رہا ہے۔ وہ کہکشاں پر کمندیں پھینکنے کی سوچ رہا ہے۔ انسان کو، اپنی ساری تاریخ میں، کبھی اس قدر کائنات گیر قوت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

تہذیبِ حاضر

لیکن ابھی اس تہذیب کی عمر، نصف صدی سے بھی زیادہ ہونے نہیں پائی کہ ان بے پناہ قوتوں کا حامل انسان پکار اٹھا ہے کہ

> ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں[۱]۔

بلکہ یہاں تک کہ

> ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں، حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے[۲]۔

چنانچہ اس قصرِ فلک بوس کی بنیادیں بری طرح سے کھوکھلی ہو رہی ہیں، اور ہر قلب حساس متوحش ہے کہ اگر گذشتہ دو عالمگیر لڑائیوں کے بعد، ایک اور دھچکا لگا، تو نہ صرف یہ کہ اس کاخِ بلند کا نام و نشان تک مٹ جائے گا بلکہ اس کے سائے کے نیچے بیٹھی ہوئی انسانیت بھی کچل کر رہ جائے گی۔

---

[۱] J. W. T. MASON — in — Creative Freedom.

[۲] G. A. DORSEY — in — CIVILISATION

۲- سوال یہ ہے کہ انسان کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ دورِ قدیم کے تمدن کے ایوانات ہوں یا عصرِ حاضر کی تہذیب کے محلات، نہ انھیں پاگلوں نے بنایا تھا نہ انہیں دیوانوں نے تعمیر کیا ہے۔ یہ نظاہائے تہذیب و تمدن، ہر دور کے انسانوں کی عقل و دانش کا ماحصل، اور اُن کی تدبیری اور انتظامی صلاحیتوں کا نچوڑ تھے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ انسانیت کی تاریخ کے مُطالعہ کے بعد، ہر صاحبِ علم و بصیرت، لامحالہ اِس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

> ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سُلجھ سکتیں..... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (personality) نہیں ہے۔ عقل، اسباب و ذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے اندھی ہوتی ہے[۱]۔

یعنی، انسانی عقل، فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر سکتی ہے لیکن انسانی معاملات کا اطمینان بخش حل دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے دائرۂ منصب سے باہر کی چیز ہے۔ انسانی معاملات کے حل کے لئے ضروری ہے کہ متعین کیا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے۔ افراد اور اقوام کے مفاد میں تصادم کیوں ہوتا ہے اور اسے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ کونسی چیز عالمگیر انسانیت کے لئے منفعت بخش ہے اور کون سی مضرت رساں۔ نوعِ انسان میں مشترک اقدار کونسی ہیں اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اِن اقدار کی حفاظت کیوں ضروری ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور ان حقوق کا تحفظ کس طرح ممکن ہے۔ ان امور کا تعین، عقل، اور اس کے مظاہر، علوم سائنس کے بس کی بات نہیں۔

> سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اِسلئے، اقدار کا متعین کرنا اسکے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وُہ، سائنس کی رُو سے، اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (لیکن یہ اُنکی غلطی ہے)..... سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اسکی دُنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر، نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے[۲]۔

۳- سوال یہ ہے کہ اگر انسانی معاملات کا حل انہی امور پر منحصر ہے اور ان کا تعین عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں، تو کیا، عقل کے علاوہ، کوئی اور سرچشمۂ علم بھی ہے جس سے ان امور کا تعین ہو سکے اور کاروانِ انسانیت، راستے کے خطرات سے محفوظ و مصئون، اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا جائے؟

---

[۱] ALBERT EINSTEIN — OUT OF MY LATER DAYS

[۲] EINSTEIN (IBID)

ہدایت خداوندی ظاہر ہے کہ اِس سوال کا جواب عقل انسانی کی رُو سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ عقل، اپنے علاوہ کسی اور سرچشمۂ علم کو جانتی ہی نہیں۔ اِس کا جواب ہمیں ایک اور گوشے سے ملتا ہے، جو پورے حتم ویقین سے کہتا ہے کہ

رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ○ (۲۰/۵۰)

یعنی جس خدا نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، اُسی نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے کہ ان اشیاء کو بتائے کہ ان کی منزلِ مقصود کونسی ہے اور وہ اس منزل تک کس طرح پہنچ سکتی ہیں۔ اِس راہ نمائی کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو خدا کی طرف سے براہ راست ملتی ہے۔

وحی کا سلسلہ اشیائے کائنات میں، وحی (یعنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی ملنے) کا یہ سلسلہ از خود جاری وساری ہے۔ ہر شے کی تخلیق کے ساتھ، اس کے اندر اس حقیقت کا علم رکھ دیا گیا ہے کہ اُس کی نشو ونما کے ذرائع کونسے ہیں اور اس نے اُنہیں کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اُس کے فرائض زندگی کیا ہیں، اور انہیں کس طرح سرانجام دیا جائے گا۔ خارجی کائنات میں، اِس راہ نمائی (ہدایت) کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے، اور حیوانات کی دنیا میں اسے جبلّت (INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے، ان قوانین (یا جبلّت) کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ (۱۶/۴۹)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ کسی کو ان سے یارائے سرکشی ومجال سرتابی نہیں۔ وَ ھُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ (۱۶/۴۹)۔ یہی وجہ ہے کہ یہ محیر العقول کارگہ کائنات، اس نظم ونسق اور حسن و زیبائی سے سرگرمِ عمل ہے کہ اس میں کہیں انتشار و اختلال نہیں۔ کسی قسم کا فتور یا فساد نہیں۔ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳)۔

انسان کی راہ نمائی لیکن انسان کی کیفیت اِس سے مختلف ہے۔ اِس کی راہ نمائی (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) پیدائش کے ساتھ، اِس کے اندر ودیعت نہیں کی گئی۔ بکری کا بچہ، پیدائشی طور پر جانتا ہے کہ اس کے لئے گھاس "حلال" ہے اور گوشت "حرام"۔ شیر کو، از خود، علم ہوتا ہے کہ اس کے لئے گوشت "جائز" ہے اور گھاس "ناجائز"۔ لیکن انسانی بچّہ کو کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اس کے لئے کونسی شے نفع بخش ہے اور کونسی مضرّت رساں۔ چہ جائیکہ اُسے خیر وشر کی تمیز اور صحیح اور غلط اقدار کی تعیین کی استعداد از خود حاصل ہو۔

آدمی اندر جہانِ خیر وشر　　کم شناسد نفعِ خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوبِ کار چیست　　جادۂ ہموار و ناہموار چیست

۴۔ انسان کے اندر یہ راہ نمائی (وحی) اس لئے نہیں رکھی گئی کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ بھی (دیگر

انسانی اختیار وارادہ اشیائے کائنات کی طرح)، اِس راہ نمائی کے مطابق چلنے پر مجبور ہو جاتا — صاحبِ اختیار

وارادہ نہ رہتا — اس کا اختیار وارادہ وہ شرفِ عظیم ہے جس سے یہ دیگر اشیائے کائنات سے ممتاز و متمیز ہے۔ یہی اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے اور اسی سے یہ مسجودِ ملائکہ اور مخدومِ خلائق ہے۔ اگر انسان کو قوتِ انتخاب حاصل نہ ہوتی تو یہ پتھر کا بت ہوتا یا زندانِ فطرت میں محبوس و پابجولاں قیدی۔ اگر اس میں سرکشی و سرتابی کی استعداد نہ ہوتی تو اس کی اصول پرستی کبھی وجہِ شرف اور باعثِ تحسین و تبریک نہ ہوتی۔ اس لئے کہ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے کی جائے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود اختیار کی جائے۔ اُس سر کے جھکنے میں خوبی ہے جس کی پیشانی میں سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں، اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں، اس کا کسی کو جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے، اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا ہی وجہِ شرفِ انسانیت ہے۔ اسی سے اس کی ممکنات مشہود ہوتی ہیں اور زندگی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بنتی ہے۔ اس کے اختیار وارادہ کا تقاضا تھا کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی اس کے اندر ودیعت کر کے نہ رکھی جاتی۔

تو کیا انسان کو اس راہ نمائی کے بغیر چھوڑ دیا گیا؟ نہیں۔ اسے بھی یہ راہ نمائی دی گئی لیکن اس کے لئے طریق دوسرا اختیار کیا گیا۔ یہ راہ نمائی "مشیّتِ خداوندی کے پروگرام کے مطابق" ایک فرد کی طرف وحی کی جاتی جو اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا اور اسے اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ اسے علیٰ وجہ البصیرت، قبول کر لیں، یا اس سے انکار کر دیں۔ انہیں بتا دیا جاتا کہ اگر وہ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے تو ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں ان سے ہمکنار ہوں گی۔ اگر اس کے خلاف چلیں گے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔

خدا کی یہ وحی، ان مقتدر ہستیوں کی وساطت سے جنہیں انبیاء کرامؑ کہا جاتا ہے، مختلف ادوار میں ملتی رہی، لیکن زمانہ کے حوادث اور انسانی تحریف کے ہاتھوں، وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ رہی۔ یہ وحی، آخری اور مکمل شکل میں، اب سے قریباً چودہ سو سال پہلے، محمد رسول اللہ کی وساطت سے، انسانوں تک پہنچی۔ اس کے مجموعہ کا نام القرآن العظیم ہے۔

قرآن کریم

۵۔ قرآن کریم، خدا کی طرف سے بتدریج نازل ہوتا رہا اور قریب تیئیس سال کے عرصہ میں تکمیل تک پہنچا۔ نبی اکرمؐ نے اس کی کتابت اور حفاظت کا پورا پورا اہتمام و انتظام کیا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے وقت، یہ اپنی مکمل شکل میں، کتابی صورت میں بھی موجود تھا اور سینکڑوں حفاظ کے سینوں میں بھی محفوظ۔ یہی کتاب اپنی اصلی شکل اور ترتیب کے ساتھ، اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، اور تاریخی شہادات سے ثابت ہے کہ ان چودہ صدیوں میں، اس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدّل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدائے جلیل نے لے رکھا ہے۔ یہ عظیم المرتبت کتاب، ابدی حقائق کا مجموعہ اور مستقل اقدار کا صحیفہ ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے مکمل راہ نمائی موجود ہے۔

انسانی تصنیف، اپنے ماحول کی پیداوار اور ایک خاص مقصد کی ترجمان ہوتی ہے، اس لئے اس کی زندگی ہنگامی اور وقتی، اور اس کی افادیت محدود ہوتی ہے۔ لیکن آسمانی کتاب کی کیفیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ فضا اور ماحول کے اثرات سے بلند اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہوتی ہے۔ نہ اس کی تعلیم کبھی پرانی اور فرسودہ ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی مقام پر انسان سے یہ کہتی ہے کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیشہ زمانے کی امامت کرتی ہے اور انسانی زندگی کے ہر تقاضے کا اطمینان بخش حل بتاتی ہے۔ اس میں افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما، ارتقاء کے اصول بھی ہوتے ہیں اور اقوام کے عروج و زوال سے متعلق قوانین بھی ——— قرآن کریم ان تمام خصوصیات کی حامل، آسمانی کتاب ہے، اور نوع انسان کے لئے آخری ضابطہ حیات ہونے کی وجہ سے، ہر حیثیت سے مکمل اور ہمہ گیر ہے۔

۶- رَبِّ جلیل کی اس کتابِ عظیم نے بتایا کہ انسان کی ناکامیوں اور نامرادیوں۔ تباہیوں اور

انسانی ناکامیوں کی وجہ

بربادیوں۔ خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی بنیادی وجہ وہ تصوّرِ حیات ہے، جو اس نے، غلط نگہی اور کج فہمی کی بنا پر، انسانی زندگی کے متعلق قائم کر رکھا ہے۔ یہ نظریہ وہ ہے جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں، مادی تصور زندگی (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے سمجھا جاتا ہے کہ انسان، حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے اور اس کی ہستی، اس کے مادی پیکر (جسم) سے وابستہ ہے، اور بس۔ اس کی زندگی، حیوانات کی طرح، طبیعی قوانین کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے، اور انہی قوانین کے مطابق، ایک دن اس کے جسم کی مشینری بند ہو جاتی ہے۔ اس سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس فرد کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا، انسان کے سامنے نہ حیوانی تقاضوں سے بلند کوئی تقاضا ہے، نہ طبیعی مقاصد کے علاوہ کوئی اور مقصد۔ عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے اور اس کے لئے جو وسائل و ذرائع اختیار کرے، ان کے جواز کے دلائل تراشے۔ اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کے سامنے "جنگل کے قانون" (یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس) سے بلند کوئی اور قانون ہو نہیں سکتا ——— اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے ——— اس سے مختلف افراد کے مفاد میں تصادم ہوتا ہے، اور جب یہی تصادم، افراد سے آگے بڑھ کر، اقوام تک پہنچتا ہے تو اس کی زلزلہ خیزیوں اور آتش فشانیوں سے انسانی دُنیا کا گوشہ گوشہ ویران ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے لئے جس قدر راستے اختیار کئے، وہ اسے، سکون و اطمینان کی جنّت کے بجائے، تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے گئے اور اس کے قصرِ حیات کی کوئی منزل بھی اپنی بنیادوں پر قائم نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حسنِ تدبّر اور دانش اطواری سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیاد ہی

کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جُزئی مرمّت سے، کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔[1]

دُوسرا تصوّرِ حیات اس کے برعکس قرآنی تصوّرِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اسے، جسم کے علاوہ، ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے، جسے، انسانی ذات (Human personality) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات، نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی، بلکہ مضمر اور خوابیدہ صورت میں ملتی ہے۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دے کر، اس کی ممکنات کو مشہود کرتے جانا، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو، اس سے انسانی زندگی، موت کے بعد، مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اسے جنتی زندگی کہتے ہیں۔ جس طرح انسان کی جسمانی زندگی کی پرورش کیلئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین، وحی کے ذریعے عطا کئے گئے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

۷۔ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی، بلکہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ اس لئے، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جو قوانین، قرآن کریم میں درج ہیں، ان سے انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لئے بھی راہ نمائی ملتی ہے۔

اِنسانی معاشرہ کی تشکیل جو معاشرہ اِن قوانین کے مطابق متشکل ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر پوری کی پوری انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اِس میں نہ افراد کے مفاد میں باہمی تصادم ہوتا ہے، نہ اقوام کے مقاصد میں تزاحم۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ جو شخص، جس قدر دوسروں کی نشوونما کرے گا، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں ہر فرد کی کوشش یہ ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کی منفعت کا کام کرے (تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہو) اُس میں مفاد کے ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اور جب باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوگا تو وہ الجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں گی جن کی وجہ سے انسانی تاریخ، یفسد فی الارض ویسفك الدّماء (عالمگیر فساد انگیزیوں اور خونریزیوں) کا عبرت انگیز صحیفہ، اور اس کا ہر ورق انسانی چیرہ دستیوں اور ستم کوشیوں کا بھیانک مرقع بن رہا ہے۔ ان قوانین کو، جو خدا کی اس عظیم المرتبت کتاب میں منقوش ہیں، مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولِ حیات کہا جاتا ہے۔ یہ اصول، انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں اور عالمگیر انسانیت کی ابدی راہ نمائی کے لئے کافی۔ ان میں نہ کسی تغیّر و تبدّل کی ضرورت ہے، نہ حک و اضافہ کی گنجائش۔ یہ ساحلِ حیات پر روشنی کے مینار کی طرح استادہ ہیں اور زندگی کی تلاطم خیزیوں اور زمانے کی طوفان انگیزیوں میں انسانی کشتی کے ناخداؤں کی منزلِ مقصود کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ عقلِ انسانی کو ان روشنی کے میناروں کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو سورج کے نور کی احتیاج۔

---

[1] ROBERT BRIFFAULT —— The MAKING OF HUMANITY.

جنتی معاشرہ

۸۔ اِن مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کے مطابق، آج سے چودہ سو سال پہلے، سرزمین حجاز میں نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقائے کارؓ کے مقدس ہاتھوں، قرآنی معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس معاشرہ نے جس قدر انسانیت ساز اور جنت بداماں نتائج مرتب کئے، انسانی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔

> دُنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون اور سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کرسکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اِس انسان (محمدؐ) نے صرف جیوش و عساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں ہی کو حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں (کے قلوب) کو بھی جو اس زمانے کی آبادِ دُنیا کے ایک تہائی حصّہ میں بستے تھے.... اس نے ایک ایسی کتاب کی اَساس پر، جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دُنیا کی مختلف نسلوں، اور زبانوں کے اِمتزاج سے ایک "اُمّتِ واحدہ" پیدا کردی — یہ لافانی اُمّت، باطل کے خداؤں سے سرکشی اور تنفّر اور خدائے واحد کے لئے وَالہانہ جذب وعشق — یہ ہیں دُنیا میں اِس عظیم ہستیؐ کی یادگاریں۔ بہت بڑا مفکر۔ بلند پایہ خطیب۔ پیغامبر۔ مقنّن۔ سپہ سالار۔ معتقدات کا فاتح۔ صحیح نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار۔ اس نظام کا بانی جس میں باطل خدا، ذہنوں کی دنیا تک میں بار نہ پاسکیں۔ بیس دنیاوی سلطنتوں اور اس کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانیؐ۔[a]

دنیاوی سلطنتوں کے اوپر یہ "آسمانی بادشاہت" انہی مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کی فرمانروائی تھی جن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قرآنی معاشرہ، اپنا نظم ونسق سرانجام دیتا ہے، اور جس سے انسانیت کے ہر گوشے سے، حیاتِ نو کے چشمے اُبلتے اور اس کی کشت امید کو سیراب کرتے ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم

اس کے بعد

رہا، نوعِ انسان اِس کی منفعت بخشیوں سے متمتع ہوتی رہی۔ اس کے بعد جب انسانوں نے اس کا دامن چھوڑ دیا، تو، حیوانی سطحِ زندگی کے تقاضے پھر غالب آگئے اور انسانی ذات کا تصوّر ان کے نیچے دب گیا۔ نتیجہ یہ کہ تباہیوں اور بربادیوں کے جس عذاب میں باقی اقوامِ عالم مبتلا تھیں، اسی میں یہ قوم بھی ماخوذ ہو گئی، اس لئے کہ قانون خداوندی کی نگاہ میں نہ کوئی قوم چہیتی ہے، نہ سوتیلی۔

---

[a] LAMARTINE — HISTORY DE LA TURQUIE (VOL. II)

جو قوم، قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے گی، خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنت سے بہرہ یاب ہوگی۔ جو ان کے خلاف جائے گی، نکبت و زبوں حالی کے جہنم میں جا گرے گی۔

۹- اُس دور ہمایوں کے بعد، قرآنی نظام دنیا میں کہیں قائم نہیں ہوا لیکن خدا کا کائناتی قانون، دنیا کو بتدریج، آہستہ آہستہ، قرآنی اقدار کے قریب لا رہا ہے۔ "آہستہ آہستہ" اِسلئے کہ کائناتی قانون کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اس کا ایک ایک دن، ہمارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ دنیا کس طرح ان اقدار کے قریب آ رہی ہے، اس کا اندازہ دو چار مثالوں سے لگائیے۔

چند مثالیں

نزولِ قرآن سے پہلے، ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت، عین "انسانی فطرت" کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن کریم نے اس تصوّر کی تردید کی اور کہا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے۔ قرآن نے یہ تصوّر دیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے مطابق نظامِ مملکت قائم کر کے دکھا دیا۔ اُس وقت عام انسانی ذہن کے لئے یہ تصوّر نامانوس تھا، اس لئے اُس نے اسے نہ اپنایا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ وہی ذہن، کس طرح اپنے سابقہ تصوّر کو چھوڑ کر قرآنی تصوّرِ مملکت کی طرف آ رہا ہے۔

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک ہے، اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ۔ قرآن نے یہ انقلابی تصوّر دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں، اس لئے کسی فرد کا دوسرے کو غلام بنا لینا، خلافِ انسانیت ہے۔ اُس وقت کے ذہن کی عام سطح نے اس تصوّر کو ناقابلِ قبول سمجھا، لیکن اس کے بعد انسان نے خود اس تصوّر کے خلاف بغاوت کی اور غلامی کو انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا۔

اُس وقت یہ تصوّر عام تھا کہ رنگ اور نسل کے اعتبار سے، ایک انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی کی ہے، نہ کہ انتسابات نسبی کی بنا پر۔ اُس زمانے نے اس تصوّر کو اپنے لئے ناآشنا پایا، لیکن اب دیکھئے کہ دنیا سے یہ قدیم تصوّر کس طرح اُٹھتا جا رہا ہے، اور قرآنی تصوّر اس کی جگہ لے رہا ہے۔

اُس زمانے میں جاگیرداری۔ زمینداری۔ سرمایہ داری کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے یہ انقلاب انگیز تصوّر پیش کیا کہ رزق کے سرچشموں کا مقصد نوعِ انسانی کی نشوونما ہے، اس لئے وسائلِ پیداوار تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں اور معاوضہ محنت کا ہونا چاہیئے، نہ کہ سرمایہ کا۔ اُس زمانے کے انسانی ذہن نے اس عظیم انقلابی تصوّر کو ٹھکرا دیا۔ لیکن اب دنیا، رفتہ رفتہ، اپنے نظام کہن سے تنگ آ کر، قرآنی نظام کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔

اُس زمانے میں، دنیا مختلف قبائل اور اقوام میں بٹی ہوئی تھی اور عالمگیر انسانیت کا تصوّر کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان ایک ہمہ گیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل کا طریق یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو، اور یہ نظام وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق قائم ہو۔ یہ بات اُس زمانے کے محدود ذہن میں سما نہ سکی، لیکن اب دیکھئے، دنیا کس طرح اقوام کی تفریق و تقسیم سے تنگ آکر، ایک عالمگیر نظام کی تلاش میں مضطرب و بیقرار ہے۔ اگرچہ اُسے اس کی بنیاد نہیں ملتی — اس کی بنیاد صرف قرآنی اقدار سے مل سکے گی۔

اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ہم، بغرضِ اختصار، انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ زبانِ وحی نے صدیوں پہلے بتا دیا کہ نوعِ انسان کے لئے صحیح نظامِ زندگی کونسا ہے۔ جن لوگوں نے اس کی صداقت پر یقین کیا، انہوں نے اس نظام کو متشکل کر دیا، اور اسکے زندگی بخش، تعمیری نتائج نے وحی کے دعوے کو سچا ثابت کر دکھایا۔ دوسرے لوگوں نے اس سے انکار کیا اور اپنے لئے تنہا عقل کی راہ نمائی کو کافی سمجھا۔ عقل نے بھی بالآخر اسی سمت کو صحیح پایا جس کی نشاندہی وحی نے کی تھی، لیکن اُسے اس نتیجہ تک پہنچنے میں ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگ گیا، اور اس کے لئے انسان کو جن جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں سے گزرنا پڑا، اس کی شہادت تاریخ کے رنگین اوراق دیتے ہیں۔

عقل کا تجرباتی طریق عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ یہ، کسی عقدہ کے حل کے لئے ایک تدبیر سوچتی ہے۔ اس پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن صدیوں کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ تدبیر غلط تھی۔ اس پر، عقلِ انسانی دوسری تدبیر سامنے لاتی ہے۔ پھر اس پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یوں پیہم ناکام تجارب کے بعد، کہیں ہزاروں سال میں عقلِ انسانی صحیح نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ لیکن انسان کو اِس کی جس قدر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اِس کے برعکس، وحی، پہلے ہی دِن، حقیقت کو بے نقاب کر کے سامنے لے آتی ہے اور اس طرح، ایک طرف انسان کا اِس قدر قیمتی وقت بچا دیتی ہے اور دوسری طرف، اسے ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رکھتی ہے جو عقل کے تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ انسان، آخر الامر، اُس نظامِ زندگی کو اختیار کرے گا جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا —— اس کے سوا اسے کوئی چارہ ہی نہیں —— لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ انسان نے (الف لیلہ کی روایتی بوتل کا کارک کھول کر) تباہی اور بربادی کی جن مہیب عفریتی قوتوں کو فضا میں منتشر کرنا شروع کر دیا ہے، اور وہ جس تیزی سے انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں، کیا اس سے اِسے اتنی مہلت ملے گی کہ یہ عقل کے تجرباتی طریق سے، قرآنی نظامِ زندگی کی پناگاہ تک صحیح و سلامت پہنچ جائے؟ واقعات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت، دنیائے تہذیب و تمدّن کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ، ایک

مغربی مؤرخ نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے۔

اُس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ . . . .

نزولِ قرآن کے وقت دُنیا کا نقشہ

غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دُنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اسکے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا جنگ وجدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے اور جن کے متعلق خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔[1]

اِس کے بعد یہ مؤرخ یہ سوال سامنے لاتا ہے کہ

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جاسکتا تھا جو نوع انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے؟

اور خود ہی اس سوال کا جواب اِن الفاظ میں دیتا ہے کہ

یہ اَمر مُوجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اُس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

قرآن اَب بھی سنبھال سکتا ہے

آج دُنیا کی حالت اُس سے کہیں زیادہ نازک اور تشویش انگیز ہو چکی ہے جو زمانہ نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ لیکن جس طرح قرآن کریم نے انسانیت کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں گرنے سے اُس وقت بچا لیا تھا، آج بھی اس میں اتنی قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ گرتی ہوئی انسانیت کو سنبھال لے، اور راستے کی پُرخطر گھاٹیوں سے بچا کر اُسے صحیح وسلامت منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اور دُنیا ایک بار پھر اس عظیم حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۲/۳۸)۔ جو قوم قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی، وہ خوف وحزن سے مامون رہے گی۔

[1] QUOTED BY IQBAL IN HIS LECTURES.

قرآن، پریشاں خاطر و افسردہ حال، حیران و سرگرداں، راہ گم کردہ انسانیت کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ (۳/۱۳۹)۔ تم تباہی و بربادی کی مہیب قوتوں سے مت خوف کھاؤ۔ تاریک مستقبل کی اندوہناکیوں اور ہلاکت سامانیوں سے مت گھبراؤ۔ جی نہ چھوڑو۔ حوصلہ نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو۔ میں جو نظام پیش کرتا ہوں اس کی صداقت پر بھروسہ کر کے اسے عملاً آزماؤ۔ اور پھر دیکھو کہ تم شکست و ریخت کی ان تمام قوتوں پر غلبہ پا کر، کس طرح، خاک کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچتے ہو۔ یہ نظام اس کے سوا کیا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، ان کے حاصل کو وحی کی عطا کردہ اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جائے اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

دُنیا میں وہی نظام حیات باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کیلئے منفعت بخش ہو۔

اس کا عملی طریق اس کا عملی طریق یہ ہے کہ ایک خطۂ زمین کو اس نظام کی تجربہ گاہ بنا کر، اس کے درخشندہ و تابناک، حیات بخش و انسانیت ساز نتائج کو دُنیا کے سامنے لایا جائے اور یوں مضطرب و پریشان اقوامِ عالم کو بتایا جائے کہ ان کے لئے امن و سلامتی کا راستہ کونسا ہے۔ ان سے کہا جائے کہ

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

تم نے تنہا عقل کی راہ نمائی کو آزما کر دیکھ لیا۔ اب ذرا وحی کی شمع نورانی کو دلیلِ راہ بنا کر دیکھو!

لیکن یہ عملی طریق وہی قوم اختیار کر سکتی ہے جو ایک طرف قرآنی نظام کو اچھی طرح سمجھے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں پر اس کی نگاہ ہو۔ میں گذشتہ پچیس تیس سال سے قرآن کو اسی انداز سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ مفہوم القرآن، جس کا تعارف آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا، اسی جہد پیہم اور سعی مسلسل کی ایک اہم کڑی ہے جو میرے مدّت العمر کے تدبّر فی القرآن کا ماحصل ہے۔ مقصد اس سے اس عظیم حقیقت کا واشگاف کرنا ہے کہ قرآن کریم، نوعِ انسانی کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتا ہے اور وہ مستقل اقدار کونسی ہیں جن کی بنیادوں پر اس فلک بوس و کہکشاں گیر نظام کی حسین و جمیل عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور وہ کس طرح، غلط نظہائے زندگی کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے انسان کے لئے گوشۂ عافیت اور مرکزِ حیات بنتی ہے۔ جب نوعِ انسانی کا یہ آخری ملجا و ماویٰ وجود میں آئے گا تو نوامیسِ فطرت اس کی طرف آنے والے انسانوں کا استقبال لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ○ (۴۱/۳۱) کی نشاط آور بشارتوں سے کریں گے۔ سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ○ (۳۶/۵۸) کی نویدِ جاں فزا و نشیدِ دل نواز ان کے لئے فردوسِ گوش

لہ اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور جس کی تم آرزو کرو۔ لہ خدائے رحیم کی طرف سے امن و سلامتی کی نویدِ جاں فزا۔

بنے گی۔ اور ندائے جمال، جنت سے نکلے ہوئے آدم سے، بکمال شفقت و محبت کہے گی کہ
تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؁ (۴۳/۷۲)
یہ ہے وہ جنت جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہو۔
(اب تمہیں اس سے کوئی نہیں نکال سکے گا۔)
اور، کامیاب و شادکام، انسان، ہزار مسکراہٹوں سے، آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا کہ
دیدۂ آغازم ـــــ انجام نگر۔
قرآن عظیم یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔

گر زمینی! آسماں سازد ترا | آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
خستہ باشی، استوارت می کند | پختہ مثلِ کوہسارت می کند
صیقلش آئینہ سازد سنگ را | از دلِ آہن ربابد زنگ را
نوعِ انساں را پیامِ آخریں | حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۹/۱۷)[1]

پرویز
جولائی ۱۹۶۱ء

۲۵۔بی ـــ گلبرگ
لاہور

یہ تھا قرآنِ کریم کا تعارف؛ قرآنِ کریم کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کی دنیا وجود میں آتی ہے، اس کے لئے فروری ۱۹۹۲ء کا شمارہ دیکھئے۔

[1] یقیناً یہ قرآن، سفرِ زندگی میں، اُس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی، ہموار اور محکم ہے۔

خدا بخش بلوچ
ایڈووکیٹ

مَن اپنا پُرانا پاپی تھا

مسلمان گھرانے میں بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا ہے جس کا مطمحِ نظر شرفِ انسانیت کی تکمیل ہے۔ یہ سبق اس نومولود کو کتنے دن یاد رہتا ہے؟ اس کا انحصار اُن لوگوں کے ایمان و ایقان پر ہوتا ہے جن کی گود میں یہ بچہ پروان چڑھتا ہے۔ یہی حال ہماری اس نوزائیدہ مملکت پاکستان کا ہے جس کے معمارِ اوّل نے، جسے اپنے مقصد کی حقانیت پر پورا پورا یقین تھا، اس مملکت کے وجود میں آنے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے تصوّر کی مسجد (پاکستان) کے وجود میں آنے پر ذرا بھی شک نہیں بلکہ میں اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
لیکن پھر ہوا کیا ــــ من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس لئے کہ دو قومی نظریہ جو پاکستان کی بنیاد اور لا الہ الا اللہ، جو پاکستان کا مطلب تھا، نگاہوں سے یوں اوجھل ہوئے کہ اس کی یاد اس اذان جتنی بھی نہ رہی جو پیدا ہوتے وقت بچّے کے کان میں دی جاتی ہے۔ ہوا یوں کہ سرزمینِ پاک کی گود وا ہوتے ہی وہ لوگ بھی عود کر آئے جو نہ نظریۂ پاکستان کے حامی تھے نہ مسلمانوں کے لئے ایک خطۂ زمین حاصل کرنے میں ان کا کوئی عمل دخل تھا۔ یہ لوگ نہ صرف پاکستان پر چڑھ دوڑے بلکہ یہی خوابانِ پاکستان کی تعمیرِ وطن میں مصروفیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے چہروں سے بدنما داغ مٹانے اور اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح دو قومی نظریہ طاقِ نسیاں ہو گیا اور لا الہ الا اللہ کی جگہ مذہبی سیکولرزم نے لے لی ــــ تھے یہ ہی دو حساب جو بیباک ہو گئے ــــ

سقوطِ ڈھاکہ نے نظریۂ پاکستان کے مخالفین کو اور بھی جلا بخشی، دوستوں اور دشمنوں کو بہت کچھ کہنے کا موقع ملا۔ اندرا گاندھی

نے کہا کہ

"یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے نہ ہماری حکومت کی کامیابی، یہ فتح ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہیں مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ ۲۵ سال کے تجربہ نے بتادیا ہے کہ ان کا نظریہ حق پر مبنی نہیں تھا۔ یہ اُن کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔"

صوبہ سرحد ہزارہ سے ایک مولوی صاحب جناب غلام غوث ہزاروی نے ۱۴ جون ۱۹۷۲ء کو کراچی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں آج محترمہ اندرا گاندھی کو خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ میں تحریکِ آزادئ وطن میں ابتداء سے شریک رہا ہوں۔ جب آپ کے والد پنڈت جواہر لال نہرو قصبہ "دفا" ضلع ہزارہ میں آئے تھے انہیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا، وہ میں نے لکھا تھا۔ انہوں نے اسے سنبھال کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ہماری جماعت نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ملکی تقسیم کو ملک و قوم اور اسلامی مفادات کے مطابق نہیں سمجھا تھا، اسی لئے ہم نے تقسیم کی مخالفت کی تھی مگر آپ کے بڑوں نے ملکی تقسیم کا فیصلہ کرتے وقت ہم لوگوں کو بالکل نظرانداز کر کے ہمیں مشکلات میں ڈال دیا جو کسی وفادار ساتھی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔"

اس سے قبل انہی مشکلات پر بابڑہ چارسدہ کا واقعہ پیش آچکا تھا جس میں خدائی خدمتگار نے آواز اٹھائی تھی کہ

"پاکستان ریت کی دیوار ہے، اٹھو اس کو نیست و نابود کردو۔"

اِدھر اسی صوبہ سرحد سے ایک مفتی نے اُٹھ کر کہا کہ

"شُکر ہے کہ پاکستان کے بنانے کے گناہ میں مَیں شریک نہیں تھا۔"

کچھ کم ہوئی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاہشیں   پھر آگیا وہ زلف پریشاں لئے ہوئے

جناب خان عبدالولی خان صاحب نے بریڈ فورڈ میں اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ ۲۵ سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ برِّصغیر کی تقسیم کے وقت اس نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے

بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ مونٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کیئے تھے، تو ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدار کہا گیا تھا۔ لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام کے نام پر ہی ٹوٹا ہے۔" (بحوالہ نوائے وقت ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

پھر ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء میں جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ علیحدگی کا مسلک کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ علیحدگی کا مسلک کوئی انوکھا مسلک نہیں، خود قائداعظمؒ علیحدگی کی تحریک کے بانی تھے انہوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی۔ اب اگر کوئی اور قائداعظم کے پیروکار بنتے ہیں، تو سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

ہمارا نقطۂ آغاز ۱۹۴۰ء ہے جب ۲۳ مارچ کو مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی زیرِ قیادت پاکستان کا مطالبہ کیا۔ یعنی برِصغیر میں ایک آزاد مملکت کا مطالبہ۔ یہ مطالبہ اس ریزولیوشن میں درج تھا۔ جناب فضلِ حق نے (جنہیں شیرِ بنگال کہا جاتا ہے) پیش کیا تھا۔ لاہور ریزولیوشن سے مقصود یہ تھا کہ پاکستان میں پورا پنجاب، پورا بنگال اور آسام مدغم کر دیا جائے۔ پنجاب اور بنگال بعد میں تقسیم ہو گئے اور آسام پاکستان کو مل ہی نہ سکا۔ انڈین انڈی پنڈنٹس ایکٹ ۱۹۴۷ء کی رُو سے انگریزوں نے اقتدار منتقل کیا، تو اس وقت بھارت تھا یا پاکستان۔ اس وقت تیسری مملکت کا وجود تھا نہ تصور۔

رُسوائے زمانہ چھ نکات کے متعلق اپنی کتاب 'عظیم المیہ' کے مصنف نے لکھا تھا۔

"چھ نکات پر مبنی شیخ مجیب الرحمٰن کا فارمولا من حیث الکُل ایک ایسی کانفیڈریشن کا نقاب پوش منشور تھا جس میں آئینی طور پر علیحدگی کے بیج پوشیدہ تھے۔ یہ فارمولا ہماری قومیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا۔ اس سے پہلے دو پاکستان وجود میں آجاتے اور اس کے بعد یہ ملک پانچ آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جاتا۔ اس کی رُو سے یہ مقصد دو مراحل میں حل ہوتا بنا بریں ہماری پارٹی نے چھ نکات کو یکسر مسترد کر دیا اور اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ اُسے ناقدانہ طور پر بھی موضوعِ بحث بنایا جائے۔"

مسلم لیگ کی حکومت میں شامل اکابرین میں سے بعض کے متعلق اپنی اسی کتاب میں انہوں نے مزید لکھا کہ

"مغربی پاکستان کے چند ایک لیڈر شروع ہی سے مجیب کی تائید کرنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ مغربی پاکستان میں اپنے اپنے صوبوں کو علیحدہ کرالیں۔ یہ وہی حضرات تھے جنہوں نے تخلیقِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان لیڈروں نے دیکھا کہ چھ نکات میں ان کے لئے پاکستان کو تباہ کر دینے کا موقع تھا۔"

شیخ مجیب نے کبھی بھی آبادی کے لحاظ سے کوئی نعرہ بلند نہیں کیا تھا، لیکن اب تو حالت یہ ہے کہ صوبہ پنجاب جو اس مرض سے بچا ہوا تھا، وہاں بھی ایک خاتون، سیدہ عابدہ حسین نے ۲/۱ ۶۲ فیصد آبادی کا نعرہ ملک کے پارلیمان کی سٹیج پر بلند کر دیا ہے جس کی بنا پر بی بی سی لندن کی ہندی نشریات میں صوبہ پنجاب کو پوربی پاکستان کا نام دیا جا رہا ہے۔

اسلامی جمہوری اتحاد اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس حقیقت کا مظہر ہے کہ اس میں شامل اکثر اکابرین کا تعلق ان جماعتوں سے ہے جو نظریۂ پاکستان کی مخالفت میں نہ صرف پیش پیش رہی ہیں بلکہ اس نظریئے کو باطل ثابت کرنے میں انہوں نے آج تک کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان جماعتوں میں بشمول جماعت اسلامی کوئی جماعت بھی ایسی نہیں جس نے اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت کے بعد بھی اپنی غلطی کو تسلیم کر کے نظریۂ پاکستان کی حفاظت کا کوئی واضح اعلان کیا ہو جس سے قوم مطمئن ہو جاتی کہ پاکستان، جس کے کان میں دو قومی نظریئے کی اذان دی گئی تھی، اگر پہلے نمازی نہیں بن سکا، تو آئندہ کے لئے سنبھل جائے۔ لیکن بظاہر جو صورت حال نظر آ رہی ہے، وہ تو اس سے مختلف نہیں کہ

فنکار وہی، ہاتھ وہی رنگ وہی ہیں
صورت ہے وہی ہے وہی تصویر پرانی

تعزیت

لندن سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق بزم یارک شائر کے سرگرم رکن، محمد بشیر خان، چند ماہ کی علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں مرحوم نے جس جرأت اور بیباکی سے حصہ لیا اس کی یاد تادیر قائم رہے گی۔ ادارہ مرحوم کے لئے مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟

مائیکل ہارٹ کی کتاب "دی ہنڈرڈ" میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پچھلے دنوں اخبارات میں متنازعہ قسم کے بیانات اور مراسلات نظر سے گذرے۔ شاید کچھ اور احباب نے بھی دیکھے ہوں، ان میں ایک مضمون مولاکو ثر نیازی کا بھی تھا جس میں انہوں نے اس کتاب کی تعریف کی تھی، جسے دیکھ کر حیرانی ہوئی اور یہی حیرانی ان الفاظ کی وجہ بنی ہے۔ ہم سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسلام اللہ کا دیا ہوا دین ہے، اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ــــ مگر مصنف شروع ہی میں ایک دانستہ یا نادانستہ غلط بیانی کرتا ہے، ملاحظہ ہو اصل متن:۔

OF HUMBLE ORIGIN, MOHAMMAD FOUNDED AND PROMULGATED ONE OF THE WORLD'S GREAT RELIGIONS..

اس عبارت میں لائقِ توجہ، غور طلب لفظ RELIGIONS نہیں، لفظ FOUNDED ہے، حضور اسلام کے بانی نہیں تھے، وہ تو خود وحی پر ایمان لانے اور اس وحی کے متبعی ہونے کے دعویدار تھے ــــ کیا کوئی مسلمان، FOUNDED کے لفظ کے ساتھ اتفاق کر سکتا ہے؟

مصنف نے بڑے ہی پرکار، SUBTLE اور کاریگرانہ انداز سے لفظوں لفظوں میں بڑی ہی بنیادی باتوں پر شکوک و شبہات ابھارنے والی باتیں کی ہیں۔ لفظوں کی معصومیت اور ان میں پنہاں معانی پہ غور کیجئے، لکھتے ہیں۔

HE IS THE AUTHOR OF MUSLIM HOLY SCRIPTURE, THE KORAN, A COLLECTION OF CERTAIN OF MOHAM-MAD'S INSIGHTS THAT HE BELIEVED HAD BEEN

DIRECTLY REVEALED TO HIM BY ALLAH. MOST OF THESE UTTERANCES WERE COPIED MORE OR LESS FAITHFULLY DURING MOHAMMAD'S LIFE TIME.

حیران ہوں کہ مولانا کوثر نیازی کیسے اس سب سے صرفِ نظر کر گئے۔ عرض گذار ہوں کہ اس بیان پر غور فرمائیں، دوبارہ، سہ بارہ، بار، بار اور اس میں چھپے بین السطور معنی تلاش کریں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ایک دیدہ دانستہ کوشش ہے، شر پھیلانے اور دلوں میں وساوس بیجنے کی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی آخری سورت میں اشارہ کیا ہے۔ (من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس)۔

غور طلب الفاظ کی نشاندہی میں کر دیتا ہوں، غور آپ فرمائیے۔ لفظ استعمال ہوا ہے AUTHOR۔ کیا حضورؐ قرآن کے مصنف ہیں، کیا یہ آپؐ کے ذہن کی تخلیق ہے، کیا یہ کسی کے ذہن کی تخلیق ہو سکتی ہے، قرآن نے تو سب مخالفین کو چیلنج دیا تھا کہ سب مل کر، اپنے حمایتیوں کو شامل کر کے اس جیسی دس ــــ ایک اور جگہ، اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھائیں!

پھر لفظ ہیں CERTAIN OF MOHAMMAD'S INSIGHTS ــــ یعنی INSIGHTS میں سے چند ــــ گویا قرآن مکمل نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا ــــ تقویت ان شکوک کو ان الفاظ سے پہنچائی گئی، MOST OF THESE UTTERANCES ــــ یعنی ان اشاداتِ نبویہؐ (حالانکہ انہیں ارشاداتِ ربانی کہنا چاہیئے) کی غالب اکثریت نقل کی گئیں حالانکہ ہمارا ایمان ہے کہ وحی ساری کی ساری محفوظ کر لی جاتی تھی، ــــ پھر الفاظ MORE OR LESS FAITHFULLY بھی قابلِ غور ہیں، یہ PHRASE کیا معنی رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ قرآن حرف بہ حرف حضورؐ کی طرف وحی کیا گیا، لفظ لفظ محفوظ ہے، قیامت تک محفوظ رہے گا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحٰفظون۔

جس مضمون میں ایسے شر انگیز جراثیم موجود ہوں، ہم اس کی ثنا خوانی کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔

محمد ارشاد

متبادل معاشی نظامِ قرآن

شریعت بل میں یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ متبادل معاشی نظام کے قیام تک موجودہ سودی بنکنگ برقرار رہے گا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ نفاذِ اسلام کے حلقوں کی جانب سے متبادل معاشی نظام کا کوئی مکمل خاکہ سامنے نہ آسکا۔ ہم اس انتظار میں رہے کہ شاید کسی ہی طرف سے اسلامی معاشی نظام کا کوئی خاکہ سامنے آئے گا لیکن آجتک خاموشی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

"انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے۔"

(بحوالہ اخبار زمیندار، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

"ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک قومیت، ایک مذہب کے باوجود محض اقتصادی نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔"

لیکن ہم نے ان امور پر توجہ نہ دی۔

۱۹۵۵ء میں محترم غلام احمد پرویزؒ صاحب نے نظامِ ربوبیت کے نام سے قرآن کا معاشی نظام پیش کیا، لیکن افسوس کہ مترفین کی طرف سے اس کی پذیرائی نہ ہوئی، بلکہ اس کی مخالفت کی گئی۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں حکومتِ پاکستان نے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ اسلامی معاشی اصلاحات کا ایجنڈا تیار کرے۔ اس کمیشن کے سربراہ پروفیسر سید نواب حیدر نقوی تھے۔ انہوں نے کمیشن کے ارکان کے ساتھ مل کر انگریزی زبان میں ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام "AN AGENDA FOR ISLAMIC ECONOMIC REFORMS" تھا۔

اس کمیٹی نے قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل کی نشاندہی کر دی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ

۱۔ ارض و سما اللہ کی ملکیت ہیں۔

۲۔ تمام ذی حیات کی رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے۔

۳۔ زمین تمام کی تمام خدا کی ملکیت ہوتی ہے۔ انسان اس کا امین ہوتا ہے نہ مالک۔

۴۔ نظامِ سرمایہ داری، ذاتی ملکیت کو مقدس قرار دیتا ہے، جو قرآن کے خلاف ہے۔
۵۔ اسلامی نظام سوشلزم سے مختلف ہے کیونکہ سوشلزم میں ذاتی ذوق اور حقِ انتخاب کی نفی کی گئی ہے اور اس میں عدل و احسان کا تصور نہیں ملتا ہے۔
۶۔ اسلامی معاشی نظام امانت، دیانت اور عدل و احسان پر استوار ہے۔
۷۔ دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ وہ اوپر والے طبقہ میں گردش نہ کرتی رہے۔
۸۔ نعمائے خداوندی پر ایک طبقہ کی اجارہ داری یکسر خلافِ اسلام ہے۔
لہٰذا اس رپورٹ کو معرضِ التوا میں نہ ڈالا جائے، بلکہ اس پر عمل درآمد کر کے کام کیا جائے۔

اِک شمع اور بُجھ گئی

وابستگانِ فکرِ قرآنی میں سے محترم ملک جان محمد صاحب کی ذاتِ گرامی سے کون واقف نہ ہوگا۔ ملک صاحب جنہوں نے اپنے علاقہ میں سب سے پہلے اس فکر پر لبیک کہا اور تادمِ آخر پیرانہ سالی کے باوجود جوانوں کی سی گرمجوشی کے ساتھ اسے سمجھنے اور سمجھانے میں ہمہ تن سعی و عمل رہے۔ کچھ عرصہ سے بعارضہ فالج صاحبِ فراش تھے۔ اس صبر آزما اور جانگسل مرحلہ میں ان کے بیٹوں نے جس ہمت، استقلال اور خندہ پیشانی سے فرزندگی کا حق ادا کیا، اس کی مثال صرف وہیں مل سکے گی جہاں قرآنی فکر نے عملی پیکر اختیار کر لیا ہو۔ مگر افسوس کہ اجل نے یہ نقشہ زیادہ دیر برداشت نہ کیا۔ پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ یہ جانکاہ خبر ملی کہ ملک صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس طرح کے صدمات کے اثرات بانٹنا تو مشکل ہوتا ہے لیکن ہم محترم ملک صاحب مرحوم کے پسماندگان کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وقت ہزاروں قلوب بہ صدق و خلوص ان کے اس غم میں شریکِ حال ہیں اور ہر ایک کے لبوں پر یہ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ (ادارہ طلوعِ اسلام)

حقائق و عبر

ماہنامہ الفاروق کراچی "قطع ید" کے متعلق اسلام کا ایک نظریہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ

"منکرات اور غیر مباح اشیاء کی چوری پر قطع ید کا حکم نہیں ملتا۔ مثلاً سونے کی صلیب یا شراب یا شطرنج یا دف و طبل وغیرہ کسی نے چرا لیا، تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ہدایہ)..... اس لئے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب منکر کو دیکھے تو حتی الوسع اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔"

(حدیث)

طلوعِ اسلام ـــــ موقر جریدے نے اپنے اس طویل مضمون میں یہ نہیں بتایا کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور وی سی آر چرانے پر کیا انعام دیا جائے گا؟

۳۔ طلاق

روزنامہ جنگ کی ۳۰ اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں ایک استفسار کے جواب میں مولوی محمد یوسف صاحب فرماتے ہیں۔

"نکاح کے لئے دو طرفہ ایجاب و قبول اور دو گواہوں کا مجلسِ عقد میں اس ایجاب و قبول کو سننا شرط ہے مگر طلاق شریعت نے مرد کے ہاتھ میں رکھی ہے اور طلاق کے لئے گواہ مقرر کرنے کو مستحب قرار دیا ہے مگر شرط لازم قرار نہیں دی۔ اس لئے طلاق بغیر گواہوں کی موجودگی میں بھی ہو جاتی ہے اور بیوی کی غیر موجودگی میں بھی۔"

طلوعِ اسلام :۔ محترم مولوی محمد یوسف صاحب کی شریعت میں اگر قرآن کو بھی دخل ہے، تو انہیں سورۂ طلاق بھی پڑھ لینی چاہیئے جس میں بیوی کو فارغ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ

۱۔ حساب کر کے ایامِ عدت کا تعین کیا جائے۔

۲۔ دورانِ عدت نہ بیوی گھر چھوڑے، نہ خاوند اسے گھر سے نکالے۔

۳۔ عدت کے اختتام پر (طلاق اگر واپس نہ لے لی گئی ہو، تو) دو منصف مزاج مرد گواہوں کی موجودگی میں مطلقہ بیوی کو بطریقِ احسن گھر سے رخصت کیا جائے۔

نقد و نظر

نام کتاب	:	دولتِ پرویزؒ
مؤلف و ناشر	:	محمد عمر دراز
طابعین	:	النور پرنٹرز و پبلشرز۔ لاہور
ضخامت	:	۲۲۰ صفحات
قیمت	:	۸۰/- روپے

ہمارے زمانہ میں برِ صغیر پاک و ہند میں جن محسنینِ ملّتِ اسلامیہ نے قوم کی نکبت و زبوں حالی کے اسباب کو سمجھ کر، اسے اللہ کی طرف سے نازل کردہ حیات آور ضابطۂ زندگی کی طرف دعوت دی اور قرآنِ خالص کی تعلیم اس کے سامنے پیش کی، ان میں سرسید احمد خانؒ، حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ، حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کے اسمائے گرامی سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی نظر میں اس جرمِ عظیم کی پاداش میں ان سب پر ان کے فتووں کے تیر چلائے گئے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کا ایک اضافی جرم بھی تھا اور وہ یہ کہ انہوں نے تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران، حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی زیرِ لوا، نیشنلسٹ علماء کی، حصولِ پاکستان کی مخالفت کے سدِّ باب کے محاذ کی سربراہی کا فریضہ بھی انتہائی کامیابی سے ادا کیا تھا۔ چونکہ اس محاذ پر بالخصوص ان علماء کو پرویزؒ صاحب کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی، اس لئے اس دوہرے جرم کی سزا (یا یوں کہیئے اپنی شکستِ پندار کے انتقام) کے طور پر مذہبی پیشوائیت نے ان تمام ذرائع ابلاغ کو جو انہیں بآسانی میسّر تھے، بروئے کار لاتے ہوئے اس زور و شور اور تسلسل و تواتر سے، پرویزؒ صاحب کے خلاف بے بنیاد پراپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا جس کے نتیجہ کے طور پر آپ کا نام تک انتہائی ردِّ عمل کا سبب بنتا گیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ 'جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ، ان کے جھوٹ کے پول کھلتے چلے گئے اور فکرِ پرویزؒ عامۃ الناس میں مقبولیت پاتی رہی۔ آج یہ حالت ہے کہ خود یہی حضرات، تقریباً ہر منبر و محراب سے، پرویزؒ صاحب کی مخصوص اصطلاحات کے بلا تأمل و تردد استعمال سے، اپنے خطبات اور تقاریر کو مؤثر بنانے میں مصروف ہیں۔

پہلے صرف دیارِ مغرب کی جامعات میں فکرِ پرویزؒ پر تحقیق ہوتی تھی، لیکن اب اعلیٰ تعلیمی اسناد کے لئے پاکستان میں بھی فکرِ پرویزؒ موضوع بن رہی ہے اور اس کی فکر پر مبنی تحقیقی مقالات پاکستانی جامعات میں پذیرائی حاصل کر رہے ہیں۔

پاکستان میں فکرِ پرویزؒ پر تحقیق کے راستے اس طرح وا ہونے پر مختلف گوشوں کی طرف سے مرکز طلوعِ اسلام میں، پرویزؒ صاحب کی شخصیت، ان کی فکری ارتقا اور علمی و ادبی کاوشوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کثیر تعداد میں استفسارات موصول ہو رہے ہیں۔ چونکہ پرویزؒ صاحب پر اس قسم کی کوئی خود مکتفی کتاب موجود نہ تھی، اس لئے فکرِ پرویزؒ کے ایک طالب علم اور طلوعِ اسلام ٹرسٹ سے وابستہ ہونے کے ناطے سے محمد عمر دراز صاحب نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور پرویزؒ صاحب کی اپنی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل یہ کتاب اس طرح ترتیب دی ہے کہ پرویزؒ صاحب کے افکار و خیالات، نظریات و عقائد اور علمی اور ادبی کاوشوں کے تقریباً ہر گوشہ سے متعلق معلومات کو مختلف عناوین کے تحت یکجا کر دیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب جو خوبصورت گرد پوش اور عمدہ جلد کے ساتھ اعلیٰ آفسٹ کاغذ پر طبع ہوئی ہے، جہاں پرویزؒ صاحب کے متعلق متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکے گی، وہیں فکرِ پرویزؒ سے آگہی حاصل کرنے کا وسیلہ بھی مہیا کرے گی۔

فکرِ پرویزؒ درحقیقت، خالقِ کائنات کے آخری ضابطۂ ہدایت، قرآنِ کریم کو اس کی خالص اور منزّہ شکل میں قوم کے سامنے پیش کرنے کی ایک جرأت آزما اور فکر انگیز کوشش ہے، اس لئے یہ کتاب متلاشیانِ حق کو قرآنِ کریم کے دامنِ سدا بہار کی طرف لانے میں، ایک قابلِ قدر کردار ادا کرے گی۔

یہ کتاب النور پرنٹرز و پبلشرز، پوسٹ بکس ۱۹۰۴ لاہور۔ ۲۵، مکتبہ دین و دانش، چوک اُردو بازار، لاہور اور طلوعِ اسلام سے دستیاب ہے۔

اعتذار

بحوالہ مضمون خواجہ ازہر عباس صاحب "وحی صرف قرآن میں ہے"، شمارہ نومبر ۱۹۹۱ء مضمون کے آخری حصہ میں مقالہ نگار نے اطاعتِ رسول کے تحت، حکومتِ اسلامی یا اسلامی نظام کے قیام کی ذمہ داری سے متعلق بعض حضرات کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے (ص ۶۶)۔ طلوعِ اسلام کی نظر میں، اس حصہ مضمون کا تعلق نہ تو نفسِ مضمون سے ہے اور نہ ہی قرآنی تعلیمات سے۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

(ایڈیٹر طلوعِ اسلام)

قرآنی تعلیم بچوں کے لئے

قاسم نوری

تباہی

قومِ نوحؑ کی کہانی

السّلام علیکم بچّو! نیا سال مبارک! ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مستقل سلسلے "قرآنی تعلیم بچوں کے لئے" کو آپ سب نے جس طرح پذیرائی بخشی اور اپنی پسند سے ہمیں آگاہ کیا اس سے ہمارے حوصلے بھی بڑھے اور اس سلسلہ کو مزید دلچسپ اور بہتر بنانے کا خیال بھی ہر لحظہ پیشِ نظر رہا۔ اکثر بچّوں نے دنیا بھر سے ہمیں جو خطوط لکھے ان میں زیادہ تر ایسے خطوط تھے جن میں کہانیوں کی فرمائشیں کی گئی تھیں اور بعض میں بچّوں نے لکھا تھا کہ قرآنی واقعات اور ہدایات کو بھی اگر کہانی کے انداز اور اسلوب میں پیش کیا جائے یعنی انہیں سبق آموز کہانی بنا کر پیش کیا جائے تو دلچسپی اور بڑھ جائے گی اور سب بچے زیادہ شوق اور توجہ سے انہیں پڑھیں گے لہٰذا نئے سال سے ہم ایسا ہی طریق اختیار کر رہے ہیں۔ آپ کو اُن تمام پیغمبروں کے حالات و واقعات بتائیں گے جن کا ذکر بالتفصیل قرآنِ کریم میں موجود ہے اور جن باتوں اور نصیحتوں کو نظر انداز کر دینے سے ان کی قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ بچّے پیغمبروں کے نام، ان کا زمانہ، ان کا ملک اور ان کی تعلیمات سے بھی واقف ہو جائیں گے اور ساتھ ساتھ یہ بھی جان جائیں گے کہ ان پیغمبروں کی آمد کا بنیادی مقصد کیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کیوں بھیجا تھا؟ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کا جو پیغام انہوں نے اپنی قوم تک پہنچایا اس کو نہ ماننے سے یا اس پر عمل نہ کرنے سے اس قوم پر کیا تباہی نازل ہوئی۔؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے جن محترم پیغمبر سے ہم آپ کا تعارف کرا رہے ہیں وہ ہیں نوح علیہ السّلام۔

یعنی سب سے پہلے جس پیغمبر کا قرآن نے ہم سے تعارف کرایا ہے ہم بھی اس سلسلۂ مضامین کا آغاز انہی کے محترم و مکرّم نام سے کر رہے ہیں۔

ایک اور بات ۔۔۔ نئے سلسلے کے آغاز سے پہلے ہم آپ کو بطور یاد دہانی یہ بھی بتاتے چلیں کہ اب تک کن کن موضوعات پر ہم قرآنی تعلیمات کو آپ تک پہنچا چکے ہیں ۔۔۔ جو بچے شروع سے اپنے صفحات کا مطالعہ کر رہے ہیں بہتر ہے وہ بھی ان پر ایک نظر اور ڈال لیں اور جو بچے تمام مضامین نہیں دیکھ سکے ہیں انہیں تو ضرور ہی چاہیئے کہ وہ پچھلے طلوعِ اسلام کے پرچے لے کر یہ مضامین پڑھیں۔ تو جناب اب دیکھئے آپ نے اب تک کیا کچھ پڑھا اور ہم نے اب تک آپ کے لئے کیا پیش کیا۔

اب تک پیش کئے جانے والے مضامین کی ترتیب یوں ہے۔

(۱) خدا (۲) انسان (۳) فرشتے (۴) رسول (۵) کتاب (۶) اللہ کی آخری کتاب (۷) ایمان (۸) وطن (۹) اسلام (۱۰) حج (۱۱) آزادی (۱۲) مسلم (۱۳) مومن (۱۴) منافق (۱۵) تقدیر (۱۶) عمل (۱۷) مکافاتِ عمل (۱۸) آخرت (۱۹) عید (۲۰) عیدالاضحیٰ (۲۱) کفر یا کافر (۲۲) کائنات (۲۳) عظیم ترین مثالی بچہ (۲۴) اچھی زندگی (۲۵) حق اور فرض۔

پیارے بچو! چونکہ قوم نوحؑ کی تباہی کی کہانی خاصی طویل ہے اور بڑی عبرت آموز ہے لہٰذا اسے بھرپور توجہ سے ایک ہی نشست میں پڑھنا مناسب ہوگا اور آپ کے صفحات تو بہت محدود ہیں ۔۔۔ آپ سے باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ جگہ ختم ہو رہی ہے۔ تو بھئی اس مرتبہ معذرت انشاء اللہ وتعالیٰ اگلے ماہ کسی تمہید کے بغیر آپ کو یہ داستان قرآنِ کریم کی اپنی زبان سے سنوائیں گے اور پھر پورا سال سُناتے رہیں گے۔

بزمہائے طلوعِ اسلام کو انتباہ!

طلوعِ اسلام کے مرکز کے علم میں یہ افسوسناک بات آئی ہے کہ بعض لوگ تحریکِ طلوعِ اسلام سے اپنی وابستگی ظاہر کر کے بزمہائے طلوعِ اسلام سے (بالخصوص بیرون ملک بزموں سے) اپنے ذاتی منصوبوں کے لئے رقوم لے رہے ہیں۔ بزمہائے طلوعِ اسلام کو ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی ایسے فرد کا طلوعِ اسلام مرکز کے کسی منصوبہ سے کوئی تعلق نہیں۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ایگزیکٹو ہیڈ طلوعِ اسلام ٹرسٹ